از

سیّد علی عبّاس حُسینی مرحوم
(۳ فروری ۱۸۹۷ء - ۲۷ ستمبر ۱۹۶۹ء)

اُردُو پبلشرز تلک مارگ لکھنؤ

نام کتاب .. .. اردو مرثیہ

مصنف .. .. سید علی عباس حسینی مرحوم

مطبوعہ .. .. نومبر ۱۹۷۲ء

ناشر .. .. اردو پبلشرز ۸۔ تلک مارگ لکھنؤ

قیمت .. .. ۱۰ روپے

پرنٹر .. ..

سٹی برانچ:

اردو پبلشرز۔ گلی متصل دوکان اے۔ سی۔ کندو نظیر آباد لکھنؤ

معذرت

جناب حسینی صاحب مرحوم و مغفور میرے کرم فرما محترم اور ایسے مخلص بزرگوں میں سے تھے جن کی شفقت و محبّت کے نقوش تا زیست باقی رہیں گے۔

"تذکرہ "اُردو مرثیہ" کا زیر نظر مسودہ مرحوم نے اپنی وفات سے دو مہینے پہلے عنایت کرتے ہوئے نہ جانے کیوں فرما دیا تھا۔

یہ کتاب، غالباً میری زندگی کی آخری تصنیف ہو۔ اگرچہ غیر مطبوعہ دوسرے متعدد مسودات بھی میرے پاس موجود ہیں لیکن دلی خواہش یہ ہے کہ اُردو مرثیے کا یہ "نیم تذکرہ" چھپ جائے اور خصوصیت کے ساتھ اسی لئے تمھارے سپرد کر رہا ہوں۔

اب اعضاء و جوارح جواب دے چکے ہیں۔ لکھنے پڑھنے کو نہ جی چاہتا ہے۔ نہ طاقت ہی رہ گئی ہے۔ لہذا اسکی کتابت بھی تم خود پڑھ لینا۔ اگر میری زندگی میں طباعت پذیر ہو جائے تو مجھے روحانی مسرّت ہوگی۔

اسکے دو مہینہ چند دن بعد ہی مرحوم اللہ کو پیارے ہو گئے۔ لیکن مرحوم کے وہ جملے نقش کالحجر بن کر رہ گئے۔ نا مساعد حالات نے برس گزار دیئے اور میں ان کا حکم پورا نہ کر سکا۔

مسودے کے ساتھ ہی مرحوم نے ایک اجازت نامہ بھی منسلک فرما دیا تھا جس میں تحریر تھا کہ:

"نقوی صاحب کو میں نے جیسا کہ خط میں لکھا ہے کہ بعض شعرا کا کلام اضافہ کردیں متشکر ہوں گا"

حسینی صاحب کی زیر نظر کتاب ان کی ایک عظیم و طویل کتاب "تاریخ ادب اردو" کا ایک باب ہے۔ چنانچہ حسب اجازت اشاعت کے لیے یہ کتاب اردو پبلشرز لکھنؤ کو دے رہا ہوں۔ اس طرح شاید مرحوم کی روح بھی مجھ سے خوش ہو جائے۔ خدا کرے کہ کتاب قرینے سے چھپ جائے تاکہ شائقین ادب سے بھی سرخروئی حاصل کر سکوں۔

نائب حسین نقوی - لکھنؤ

عرض ناشر

خیال بھی نہ تھا کہ حسینی صاحب مرحوم کی کوئی غیر مطبوعہ کتاب میرے ہاتھ آسکتی ہے۔ حسینی صاحب کے افسانے اور دوسری تخلیقات اردو ادب میں ہمیشہ ہمیشہ جگمگاتی رہیں گی۔ ان کے متعلق میرا کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ اس سلسلے میں نقادانِ فن اور صاحبانِ ادب نے بہت کچھ لکھا ہے اور ہمیشہ لکھتے رہیں گے۔ میں زیر اشاعت مسودے کے سلسلے میں بھی کوئی تنقیدی نگاہ تو نہیں ڈال سکتا لیکن اتنا کہ میرے اور میرے ادارے کے لئے اردو مرثیہ کی اشاعت و طباعت قابل فخر ضرور ہے۔ خصوصاً ایسے وقت جبکہ میں پہلی سالگرہ کے موقع پر اردو کی مخصوص پچاسویں کتاب شائع کرکے جشن زرین منانے کا تصور کر رہا تھا۔ لیکن کوئی کتاب ایسی ذہن میں نہ تھی جو اس اہم موقع پر شائقین ادب کی خدمت میں پیش کرکے سرخروئی حاصل کرسکوں۔

اس سلسلے میں جناب سید نائب حسین صاحب نقوی کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ آپ نے میری اس مشکل کو حل کر دیا۔

حسینی صاحب کو مرثیے سے جو شغف تھا اس کا اندازہ یادگار انیس کے سلسلے میں مرحوم کی خدمات سے لگایا جاسکتا ہے۔ مرحوم نے یادگار انیس کے سکریٹری کی حیثیت سے میر انیس کی محلسرا کی بقا کے لئے بنیادی خدمات انجام دی تھیں اور یہ کتاب بھی اسی عہد کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔

....

”اردو مرثیہ“ پر ہمارے معاصرین نے بھی متعدد کتب تالیف کی ہیں۔ حدود سے آگے بڑھ کر عہد انیس سے لیکر آج تک کے مراثی اور مرثیہ گو شعرا کا کلام قطعی نئی اور اچھوتی تخلیق ہے جس میں محدود روایات سے بلند ہوکر بہ نظر صنف مرثیے کو پیش کیا گیا ہے اور یہی صفت اس کتاب کو دوسری کتب سے منفرد بنا دیتی ہے۔

ایک طرف تو وہ کتاب ”اردو مرثیہ“ ادارے کی پچاسویں طباعت کی حیثیت سے پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں دوسری طرف حسینی صاحب مرحوم کی بھولی ہوئی یادیں بھی اس کتاب سے وابستہ ہیں جو ان کی یادگار رہنے کے مرادف ہوگئی ہے۔

ناچیز

مرزا امیر علی — اردو پبلشرز۔ لکھنؤ

عنوانات

چوتھا باب

مُقدّمہ

اردو مرثیہ پر یہ کتابچہ اس ضخیم کتاب کا ایک باب ہے جو میں نے اردو شاعری اور اس کے اصناف پر اعتراضات کے جوابات لکھنے کی جسارت کی ہے۔ مرثیہ چونکہ ہماری شاعری کا اہم ترین جز ہے۔ غیر تقلیدی اور اوریجنل، ہمارے شاعروں کی ایجاد اور عالمی و آفاقی، شاعری میں ہماری زبان کا ایک جاندار، پائیدار اور حسین و جمیل افسانہ، اس لئے اس صنف پر اعتراضات کے جوابات پیش کرنے میں قدرے تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔

اس طول کلام کی خاص وجہ یہ بھی ہے کہ ہماری نسل اپنے بیش بہا خزانے کے وجود ہی سے عام طور پر ناواقف ہوتی جاتی ہے۔ اس بے خبری کے اسباب بہت سے ہیں، ایک تو ہماری زبان کی کسادبازاری پھر اردو کی تعلیم کا مدارس میں لازم نہ ہونا ہماری عربی اور مذہبی درسگاہوں تک میں اس کا داخل نصاب نہ کیا جانا، مرثیہ کا غزل و نظم کی طرح نشاط آور اور طربیہ نہ ہونے کی وجہ سے مشاعروں میں جگہ نہ پانا، اپنے محل خاص یعنی مجالس عزا سے بھی مرثیہ خوانی کے رواج کا اٹھ جانا، نوجوانوں میں پچھلی روایات تہذیب سے بغاوت کا زور پکڑ لینا، ان کا مذہبی و اخلاقی اقدار سے اغماض کرنا اور خود ان کے اساتذہ کا اپنی کم آگاہی اور سہل پسندی

کی وجہ سے اس صنف سخن سے بیگانگی برتنا۔ یہ تمام ایسے عوامل ہیں جن کی
وجہ سے مرثیوں کا مطالعہ حد درجہ محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اور اردو شاعری کے
سب سے زیادہ تابناک جواہر پاروں سے آگہی و واقفیت روز بروز بہ انحطاط ہے
کس درجہ افسوسناک یہ امر ہے کہ اس وادی گلپوش اور چمن لالہ زار
کی باغبانی و آبیاری کرنے اور ناواقف بلبلوں اور غیر بلبلوں کو اس کی سیاحت
کی طرف مائل کرنے اور گلہائے ہزار رنگ سے ان کے دامن بھر دینے کی جگہ
ہمارے ناعاقبت اندیش ناقدین و مبصرین بس اسی پر تلے دکھائی دیتے ہیں۔
کہ وہ اس کے خالی خالی خارزاروں کا بہ استہزاد تذکرہ کریں اور اپنی کوتاہ نظری
اور کم نگاہی کو دیدہ وری اور ژرف بینی کا نام دے کر ناپختہ دماغوں سے
غلط طور پر داد سخن سنجی لیں۔

اردو مرثیہ میں بزم، رزم، اور ڈراما کے عناصر مرکب صورت میں موجود
ہیں۔ مناظر فطرت و قدرت کے بہترین مرقع اور بیانیہ شاعری کے اعلیٰ ترین نمونے
ہمیں یہیں ملتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے نہ صرف نادر تشبیہیں اور اچھوتے استعارے
ہی دستیاب ہوتے ہیں۔ نہ صرف ہم میں زبان و بیان پر تصرف کی بے پایاں
قدرت و قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور نہ صرف ہم اردو کی شیرینی، لوچ
اور نزاکت و لطافت و نزہت سے آگاہ ہو جاتے ہیں، بلکہ ان کی مزاولت
سے ہمارے کردار سدھر جاتے ہیں اور ہماری سیرتیں سنورتی ہیں، ہمیں شرافت نفس
صداقت لہجہ، خودداری اور خود اعتمادی، عزم و استقلال، پامردی، اور جوانمردی
ایمان و ایقان جذبۂ ایثار و قربانی، انکسار و عبودیت اور راضی برضائے الٰہی
رہنے کی تعلیم بھی ملتی ہے اور ان تمام صفات و خصوصیات کے اسباق بھی ملتے
ہیں جو انسانیت کے جوہر ہیں اور جن کے حصول سے ہم اشرف المخلوقات کہلانے
کے مستحق بن سکتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ اس ہمہ حسن و خوبی اردو کے عاشق و محب اردو مرثیہ کے
معاملے میں اپنی اس بیگانہ اور ایک حد تک معاندانہ روش کو بدلیں یہ تبدیلی

آسان بھی ہے۔ اور مستحسن بھی۔ ہمیں چاہیئے کہ مجالس میں مرثیہ خوانی کا دستور پھر رائج کریں۔ انگریزی اور عربی مدارس میں اُردو کی تعلیم لازمی قرار دیں۔ اور یونیورسٹیوں میں اُردو کے طلباء کے لئے مرثیہ بطور ایک مستقل مضمون کے پڑھائیں اس موضوع پر مختلف زاویوں سے ریسرچ کرنے کی ترغیب بھی دیں اور طلبا کے اخلاق و اطوار سدھانے اور ان میں صحیح جذبۂ انسانیت و شرافت پیدا کرنے کے لئے مرثیوں سے کام لینا چاہیئے۔

غزل نے ہمیں ضرورت سے زیادہ رومان پسند بنا دیا ہے۔ نظم جدید ہمیں اپنی "انا" کے ماسوا سب سے نظر پھیر لینے کی ترغیب دے رہی ہے، یا شعور و تحت الشعور اور لاشعور کے لامتناہی جال میں پھنسا رہی ہے۔ اس لئے شدید ضرورت ہے کہ ہم اپنا توازن قائم رکھنے کے لئے پھر مرثیے کی طرف پلٹیں۔ مجھے تسلیم ہے کہ اس سے غنیمت پسندی کی طرف رجحان بڑھے گا۔ مگر نوجوان کی سیرت و کردار کی اصلاح رہنمائی انھیں غنیمت پسندی ہی بنا کر کی جا سکتی ہے۔

اس مختصر سی کتاب میں اس کی گنجائش نہ تھی کہ اردو مرثیہ کے سارے محاسن شمار کرائے جاتے یا سارے جواہر پارے بطور مثال پیش کر دیئے جاتے۔ یہ تو اس معدن کے چند ذرّے اور ریزے ہیں جو معترضین کے جوابات کے سلسلے میں بطور نمونہ پیش کئے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہی "مشتے نمونہ از خروارے" ناظرین کو پورے خروار پر نظر ڈالنے کی طرف مائل و ملتفت کرے اور یہی مؤلف کی عین تمنا ہے!

اردو مرثیہ آفاقی و عالمی شاعری میں ہر نہج سے ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اور ہمارے دیدہ وروں کی ہر طرح کی توجہ کا مستحق۔ خدا کرے یہ کتابچہ اس توجہ کو جنبش میں لانے کا باعث بنے!

میں حبیب مکرم جناب مولانا اختر علی تلہری کا خاص طور سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کے مسودے کو پڑھ ڈالنے

کی زحمت برداشت کر کے مجھے اپنی تحریر پر نظر ثانی کرنے کی صعوبت سے بچا لیا۔ علالت کی حالت میں ان کی یہ پر خلوص "زحمت کشی" مجھ پر احسان عظیم ہے۔

سید علی عباس حسینی
۷ر نومبر سنہ ۶۸ء
لکھنؤ

باب اول

اردو مرثیہ

مرثیہ بھی ایک قسم کا قصیدہ ہے۔ سوائے نعت ومنقبت اور قصائد کے قصید
ں عموماً کسی زندہ شخص کی مدح کی جاتی ہے۔ مراثی میں کسی مردہ شخص کے فضائل
امناقب بیان کرکے اس کی موت یا شہادت پر اظہارِ تاسف کیا جاتا ہے۔ اردو
رثیوں میں ابتداءً عربی وفارسی کی تقلید کی جاتی تھی یعنی بیس پچیس اشعار کے مرثیے
واکرتے تھے لیکن انیسویں صدی میں دلگیر و فصیح، ضمیر و میر خلیق اور ان کے ہمعصروں نے
ں کو بہت وسعت دیدی۔ اور میر انیس اور مرزا دبیر نے اس کو معراج کمال تک
ہنچا دیا۔ چونکہ زیادہ تر مرثیے واقعات کربلا اور شہدائے کربلا ہی کے متعلق لکھے گئے
ں لئے اردو میں مرثیہ بیشتر انھیں حضرات کی مدح اور شہادت کے بیان تک محدود
وگیا اور چہرہ، رخصت، سراپا، گھوڑے اور تلوار کی تعریف، جنگ اور بعد شہادت
ین اس صنف کے خصوصی عناصر بن گئے۔

مولانا حالی نے اس کی نشو ونما یوں بیان کی ہے:۔

"قصیدہ اور مرثیہ میں فرق صرف اتنا ہے کہ زندوں کی تعریف کو قصیدہ کہتے ہیں
ور مردوں کی تعریف کو جس میں تاسف اور افسوس بھی شامل ہوتا ہے۔ مرثیہ کہتے ہیں۔
مارے شعراء نے مرثیہ میں ایک خاص قسم کی نمایاں ترقی ظاہر کی ہے۔ مرثیہ کا اطلاق ہمارے
ں زیادہ تر شہدائے کربلا اور خاص کر جناب سید الشہدا کے مرثیے پر ہوتا ہے۔
و مرثیے اول اول لکھے گئے ہیں وہ کم و بیش بیس تیس شعر یا بیس تیس بیت سے

زیادہ نہ ہوتے تھے اور ان میں رثائیت یا بین کے سوا اور کوئی مضمون نہ ہوتا تھا۔
رفتہ رفتہ مرثیے کی لے بڑھتی گئی۔ اگرچہ یہ ترقی براہ راست مرثیہ کی ترقی نہ تھی بلکہ اردو شاعری
میں ایک قسم کا ایجاد تھا کہ جس نظم کی بنیاد محض بین اور مرثیت پر ہونی چاہئے تھی۔
میر انیس نے اس طرز کو معراج کمال تک پہنچا دیا انھوں نے بیان کرنے کے نئے نئے
اسلوب اردو شاعری میں کثرت سے پیدا کئے۔ ایک نیا میدان صاف کر دیا اور
زبان کا ایک معتبہ حصہ جسکو ہمارے شاعروں کے قلم نے مس تک نہ کیا تھا اور جو محض اہل
زبانوں کی بول چال میں محدود تھا اس کو شعراء سے روشناس کرا دیا۔

اس خاص طرز کے مرثیے کو، اگر اخلاق کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی ہمارے
نزدیک اردو شاعری میں اخلاقی نظم کہلانے کا مستحق صرف انھیں لوگوں کا کلام
ٹھہر سکتا ہے بلکہ جس اعلیٰ درجہ کے اخلاق ان لوگوں نے مرثیہ میں بیان کئے ہیں ان
نظیر فارسی بلکہ عربی شاعری میں بھی ذرا مشکل سے ملے گی۔

میر انیس کے کمالات کا اعتراف حالی نے بڑی کشادہ دلی سے کیا ہے
لیکن انھوں نے اردو مرثیوں پر چند اعتراضات بھی کئے ہیں چونکہ اس کتاب کا موضوع
ہی ہر طرح کے اعتراضات کے جوابات ہی پیش کرنا اور دلائل کے ساتھ مثالیں پیش
کرنا ہے۔ اس لئے اب حالی کے اعتراضات بھی ملاحظہ کیجئے۔ اور دوسرے معترضین نے
جو کچھ فرمایا ہے اسے بھی اور جوابات مع مثالوں کے سماعت فرمائیے اور انصاف
فرمائیے کہ مولف کا یہ خیال کہ اردو مرثیہ آفاقی ادب کے حصہ نظم میں ایک مستقل اور
نادر اضافہ ہے اور اس کی جیسی مکمل شاعری کسی زبان میں نہیں پائی جاتی۔

حالی کے اعتراضات

کس حد تک درست و صحیح ہے۔ حالی نے اردو مرثیہ پر جو
اعتراضات کئے ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) جو اثر ایسی اخلاقی نظموں سے انسان کے دل پر ہونا چاہیئے وہ ان مرثیوں
کے سامعین کے دل پر نہ ہوتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس کے وجوہ ان کے نزدیک
دو ہیں۔

(الف) اوّل تو یہ خیال کہ مرثیہ کا اصل مقصد رونا اور رلانا ہے۔ سامعین کو دوسری طرف

متوجہ نہیں ہونے دیتا۔"

(ب) دوسرے یہ اعتقاد کہ جو کچھ صبر و استقلال، شجاعت و ہمدردی، وفاداری و غیرت و حمیت و عزم بالجزم اور دیگر اخلاق فاضلہ امام ہمام اور ان کے عزیزوں اور دوستوں سے معرکۂ کربلا میں ظاہر ہوئے وہ مافوقِ طاقت بشری اور خوارقِ عادات سے تھے، کبھی ان کی پیروی اور اقتدار کرنے کا تصور ہی دل میں آنے نہیں دیتا۔

(۲) مرثیہ میں رزم بزم اور فخر و خود ستائی اور سراپا وغیرہ کو داخل کرنا لمبی لمبی تمہیدیں .... گھوڑے تلوار وغیرہ کی تعریف میں نازک خیالیاں اور بلند پروازیاں کرنی؛ اور شاعرانہ ہنر دکھانے مرثیے کے موضوع سے بالکل خلاف ہیں۔

(۳) مرثیے کو صرف واقعۂ کربلا کے ساتھ مخصوص کرنا اور تمام عمر اسی ایک مضمون کو دہراتے رہنا، اگرچہ بہ نیت حصول ثواب ہو تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن شاعری کے فرائض اس سے زیادہ وسیع ہونا چاہیئے۔

مولانا شبلی کا اعتراض

مولانا حالی کے بعد کے ناقدین میں سے علامہ شبلی نے بھی جہاں اردو مرثیوں اور مخصوص طور پر انیس کے کلام کو اپنی لاثانی کتاب موازنہ انیس و دبیر میں اردو نظم کا بہترین حصہ ثابت کیا ہے؛ وہاں انھوں نے بھی مرثیہ گویوں کی تعریف کے ضمن میں ان پر تاریخ سے انحراف کا الزام بڑی خوبصورتی سے لگایا ہے اور خود واقعۂ کربلا کی اہمیت و عظمت بھی ایک حد تک گھٹا دی ہے ان کا ارشاد ہے:۔

"کربلا کے واقعات جو امیر انیس اور تمام مرثیہ گویوں کا موضوع شاعری ہے، جہاں تک تاریخ و روایت سے ثابت ہے نہایت مختصر ہیں۔ لیکن مرثیہ گویوں نے ان میں نہایت وسعت پیدا کی ہے بعض جگہ محض ایک اجمالی واقعہ مذکور تھا، اس کو اس قدر وسعت دی کہ واقعات کے جزئیات بیان کر دیئے" "بعض جگہ روایت میں اس واقعہ کا نام و نشان بھی نہ تھا لیکن اس لحاظ سے کہ وقت اور حالت کے اقتضا سے اس واقعہ کا پیش آنا ضرور تھا۔ واقعہ کو فرض کر لیا ہے۔"

یہ تو دو عوبی کے ان فعل کے جو اردو مرثیہ کے قدردان بھی کچھ اعتراضات تھے

اب دو انگریزی زبان کے پروفیسروں نے جو اردو مرثیہ پر اعتراضات وارد کیے ہیں انھیں بھی ملاحظہ فرمائیے۔ ان دونوں معترضین کے اعتراضات میں وہ ساری باتیں آجاتی ہیں جو بعض اور حضرات نے اردو مرثیہ کے سلسلہ میں بطور تعریض کہی ہیں اس لیے انھیں کا بیان کافی ہے

کلیم الدین احمد کے اعتراضات

"مرثیے کا میدان ایک طرف تمام اصناف شاعری سے وسیع تر ہے۔ تو دوسری جانب نہایت تنگ۔ مرثیہ رزمی شاعری کا مترادف ہوسکتا ہے رزمی شاعری کی وسعت آشکار ہے لیکن مرثیہ میں مضمون ایک محدود مذہبی جذبے سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس کے بیان میں وہ شاعرانہ صداقت ممکن نہیں جو رستم و سہراب کی خونی داستان میں ہے۔ شاعر و سامعین ایک زبردست مذہبی جذبے سے متاثر ہوتے ہیں اس لیے شاعر اسے محض شاعری تصور نہیں کرتا۔ اور سامعین بھی اسے معیار شاعری سے نہیں جانچتے

(۲) رزمیہ شاعری میں لطف اس وقت ممکن ہے جب دو ہم پلہ مخالف ہوں۔ اگر ایک جری بہادر جملہ کمالات کا مجموعہ اور دوسرا محض کم ہمت و کمینہ ہو تو پھر نزاع میں کوئی لطف باقی نہیں رہتا۔ مرثیہ گو اپنے مذہبی جذبے سے مجبور ہو کر اسی غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ رزمیہ شاعری میں دلچسپی اسی وقت ممکن ہے جب مخالف بھی زور و طاقت، جمعیت و جرأت میں ان کا ہمسر ہو، ورنہ ان کی بہادری کا نقش صاف نہیں اتر سکتا، اور جنگ و نزاع میں شاعرانہ دلکشی ممکن نہیں۔"

(۳) واقعۂ کربلا کو ایک مسلسل و مربوط نظم میں بیان کرنا ممکن تھا، لیکن اس کی بھی اردو شعرا میں نہ ہمت تھی، نہ طاقت۔ ہر مرثیہ بجائے خود مکمل تصویر کہا جاتا ہے لیکن اس کی تکمیل فاسد ہے۔ یہ پورے واقعہ سے بحث نہیں رکھتا بلکہ کسی مخصوص جزو کا بیان ہوتا ہے...... یہ ممکن ہے کہ مختلف مراثی کو ترتیب وار جمع کر کے اس معرکۂ عظیم کا اندازہ کیا جا سکے، لیکن کسی مرثیہ گو نے اس خیال سے اپنے مراثی نہیں لکھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو شعرا میں قوت تعمیر مفقود ہے جیسے ایک شعر مفرد دوسرے شعر سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک مرثیہ ہنگام تحریر دوسرے مرثیہ سے

کوئی لازمی ربط نہیں رکھتا۔

(۴) مرثیہ کا ایک حصّہ بین کے نام سے موسوم ہے۔ بین ہی اصل مرثیہ ہے۔ مرثیہ گو کا اوّلین فرض رونا اور رلانا تصوّر کیا جاتا ہے اس لئے بین مرثیے میں گویا تمام ہی نظر آتا ہے...... اس زار نالی کا عنصر مرثیے میں ضرورت سے زیادہ غالب نظر آتا ہے......"

(۵) اشخاص کی تعداد کافی ہے... لیکن کسی کی شخصیت صاف نظر نہیں آتی۔

(۶) پھر یہ افراد نہ خالص عرب نظر آتے ہیں نہ ہندی بلکہ ان کی ذات میں دونوں قسم کے اجزا ملتے ہیں عموماً ہندی جزو غالب نظر آتا ہے۔"

ڈاکٹر احسن فاروقی کے اعتراضات

ڈاکٹر فاروقی نے رسالہ "نگار" لکھنؤ میں ایک طویل مضمون "مرثیہ نگاری اور میر انیس" کی سرخی سے لکھا تھا۔ اس مضمون میں فاروقی صاحب نے نہ صرف انیس پر اعتراض کئے تھے بلکہ اردو مرثیہ نگاری کی پوری صنف پر۔ نیاز فتحپوری مدیر نگار ان کے ہم خیال تھے۔ انھوں نے اس مقالہ میں جا بجا اپنے قلم کی طنز نگاری اور دل آزاری بھی بڑھا دی تھی جس کی وجہ سے ادبی حلقوں میں کچھ دنوں تلخی اور ناخوشگواری کی فضا پیدا ہو گئی تھی ہمارے نزدیک ادبی مباحث میں یہ روش کہ جس سے باہمی شکایت ضرور ہی حد درجہ غیر مستحسن ہے۔ بہر حال ڈاکٹر فاروقی نے جو اعتراضات کئے ہیں وہ مختصراً حسب ذیل ہیں:

۱۔ "چونکہ مرثیہ صرف ایک ذات اور صرف ایک واقعہ (یعنی شہادت) سے متعلق ہے اس لئے اس کا میدان بہ لحاظ بیان و فلسفہ دونوں طرح بہت محدود ہو گیا ہے۔ یعنی صرف ایک ہی واقعہ کو ہمیشہ پیش کیا گیا اور ایک ہی قوم کے طبقۂ عوام کے جذبات کو ابھارا گیا..."

---

[1] ڈاکٹر فاروقی نے اس مضمون پر نظر ثانی کر کے کتابچہ کی صورت میں شائع کر دیا ہے اور بہت بڑی حد تک اپنی پچھلی رائے بھی بدل دی ہے۔ یہاں اس مضمون میں مذکورہ اعتراضات سے بحث ہے۔

۲ ؎ ”مرثیہ کا مقصد محض رلانا ہے ... غم کے علاوہ دوسرے قسم کے جذبات اس کے دائرے سے باہر ہو گئے۔“

۳ ؎ ”اپنے سامعین کو رلانے کے لئے مرثیہ گو کے لئے ضروری پڑتا ہے کہ وہ امام علیہ السلام اور ان کے اعزا و انصار کے واقعات جرأت و اخلاق سے زیادہ انکی مظلومی پر زور دے اور امام کی بابت وہی باتیں کی جائیں جو ان کی مظلومی و بیچارگی ظاہر کریں۔“

۴ ؎ ”اس میں زندگی اس طرح پیش ہو ہی نہیں سکتی جیسی ناول، ڈرامہ، ایپک وغیرہ میں پیش کی جاتی ہے اور اس میں زندگی میں وہ وسیع النظری نہیں مل سکتی جو غیر مذہبی ادب میں پائی جاتی ہے۔“

۵ ؎ ”ارسطو نے یونانی ڈرامہ اور ایپک کے مطالعہ کے بعد ان کا مقصد یہ بتایا تھا کہ وہ خوف کے جذبات کو دور کر دیتے ہیں ... یورپ میں حزنیہ ادب کا مقصد رلانا نہیں بلکہ دکھے ہوئے دلوں کو تسکین دینا ہے اور غم کی تصویر اسی طرح پیش کی جاتی ہے کہ دیکھنے والوں کو تسکین ہو جائے۔ اس لحاظ سے مرثیہ ان اصناف کے دائرے سے بالکل باہر ہو جاتا ہے، جو شعریات میں شامل کی جاتی ہیں۔ اور اس کا شمار پست عوامی ادب ہی میں کیا جا سکتا ہے۔“

۶ ؎ ”مرثیہ کا کسی تاریخی واقعہ پر مبنی ہونا تو ضروری ہے، مگر مورخانہ احتیاط سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور مرثیہ گو اس کو بہت کچھ گھٹا بڑھا کر پیش کرتا ہے۔“

۷ ؎ ”امام حسین کے کردار میں ہم کو فلسفہ اور اخلاق دونوں کے نہایت بلند نکتے ملتے ہیں، لیکن مرثیہ میں ان کو صرف اس لئے نظر انداز کیا گیا کہ ان کے بیان سے سامعین پر کوئی رقت طاری نہیں ہو سکتی۔“

۸ ؎ ”حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ بنیادی طور پر ادبی چیز ہے ہی نہیں۔“

۹ ؎ ”مرثیہ تصنیف کرنا اور اس کا مجلس پڑھنا کل دینی تھا۔ انہوں نے کوئی فلسفہ اخلاق اس میں پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔“

۱۰ ؎ ”مرثیوں میں امام کے ظاہری حسن کا ذکر کرتے ہیں اور یہ سراپا کبھی کسی بین بند و بھونڈ جاتا ہے۔ لیکن صحیح تصویر پیش کرنے کی جگہ صرف مبالغہ آمیز تشبیہات و استعارات

سے کام لیا جاتا ہے اور مبالغہ کی دنیا میں اس ٹوپی کو ہر سر پر منڈھا جا سکتا ہے ۔"

۱۱ " یورپ کے نقطۂ نظر سے یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایک شخص کے صبر کی غلو کے ساتھ تعریف کی جائے اور پھر اسی کو روتا دھوتا اور آہ وزاری کرتا دکھایا جائے ۔"

۱۲ " مرثیہ اس قدر مختصر صنف ہے کہ اس میں کوئی قصہ مع اپنے متعدد واقعات کے ساتھ لایا ہی نہیں جا سکتا ، اس میں صرف ایک مختصر افسانہ کی جگہ ہے جو ایک ہی واقعہ رکھتا ہے ۔"

۱۳ " اس کے مختلف اجزا (تشبیب ، مدح ، بزم ، رزم ، مصائب وغیرہ بالکل بے جوڑ ہیں ۔ اور ان میں کہیں کوئی تاثراتی وحدانیت نہیں پائی جاتی ۔"

۱۴ " کیا مرثیوں میں ہمیں انسانی زندگی کی بابت کوئی خاص نقشہ ، کوئی خاص نظریہ یا کوئی خاص خیال ملتا ہے ۔؟ یہ سوال کر کے ڈاکٹر فاروقی نے یہ ثابت کیا ہے کہ مرثیہ " میں عامیانہ نفسیاتی باتوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا " اور مرثیہ کا " اس قدر محدود دائرہ ہے کہ اس میں کسی وسیع نفسیاتی خیال کو پیش ہی نہیں کیا جا سکتا ۔"

۱۵ " میر انیس مرثیہ کو مداحی کے سوا کچھ نہ سمجھتے تھے ۔ یعنی ان کے لئے مرثیہ لکھنا یا قصیدہ لکھنا ایک ہی طرح کے عمل تھے ۔ یہ خیال ان کا بالکل فطری تھا ۔ کیونکہ ہماری شاعری کی عام روایات کی بنا پر ہر شخص خواہ طبقۂ عام سے تعلق رکھتا ہو یا خواص سے ، مدح سرائی ہی کو شاعری سمجھتا تھا ۔

۱۶ " مداحی اور بین نگاری ..... دونوں چیزوں کے اجتماع سے بیک وقت مرثیہ کے مواد پر کیا اثر پڑتا ہے ۔؟ غور سے دیکھئے تو یہ دونوں متضاد چیزیں ہیں اور اگر انیس یورپ میں پیدا ہوتے اور وہاں کی روایات شاعری کے درمیان پلے ہوتے تو وہ ان دونوں متضاد چیزوں کو ایک ساتھ رکھتے ہی نہیں ۔ اور اگر رکھتے تو ان دونوں میں کسی خاص شاعرانہ ربط کی صورت نکال لیتے مگر مرثیوں میں کبھی ایسے ربط قائم کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی ۔" (۱۷) کردار نگاری مختلف نفسیاتی اجزا کو ملا کر ایک کل تخلیق ہو اور ہر حالت میں

اس کی کچھ انفرادی صفات نمایاں کرے اور ان مختلف صفات کو ایک جگہ کرنے پر ایک ایسا کل ذہن میں آئے جو جیتے جاگتے انسانی افراد کی طرح معلوم ہو، تو ایسی تخلیق کو ہم کردار کہیں گے۔ مرثیوں میں بھی جزئیات ہی پر زیادہ زور ہے، لیکن جب ہم ان جزئیات کو ملا کر ایک کل بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو ناکامیاب رہتے ہیں۔"

اظہر علی فاروقی کے اعتراضات

چند سال ہوتے ہیں کہ پروفیسر اظہر علی فاروقی نے ایک کتاب "اردو مرثیہ" کے نام سے لکھی ہے اور مرثیئے کے سلسلے میں بڑی حد تک داد تحقیق دی ہے۔ انھوں نے اردو کے علاوہ کشمیری، تلیگو، اور بنگالی مرثیوں کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ ——— اور اردو مرثیہ گویوں پر چند اعتراضات کئے ہیں ان میں دو تین وہی ہیں جو دوسرے معترضین سے آپ سن چکے ہیں۔ لیکن ایک اعتراض ایسا ہے جو صد درجہ مقبول اور قابل توجہ ہے اور جس نقص کا دور کرنا جدید مرثیہ گویوں کا فرض ہے۔ بہر حال ان کے اعتراضات بھی ملاحظہ ہوں:-

(۱) مرثیہ گو سراپا میں افراد مرثیہ کا حلیہ بیان کرتا ہے...... قصیدے کے مانند یہاں بھی ممدوح کے چہرے خدوخال، لب دندان، چشم و ابرو وغیرہ کے حسن و جمال کا نقشہ کھینچا جاتا ہے۔ اگرچہ ابن قدامہ قصیدے میں یوں کرنا معیوب سمجھا ہے۔

(۲) بین میں مردوں کے منھ سے ایسی باتیں نکلوانا جن سے ان کے صبر و تحمل، مردانگی و شجاعت کو صدمہ پہونچتا ہو۔ عورتوں کی زبان سے ایسے الفاظ کہلانا جن سے ان کی متانت، وقار، محبت اور غیرت کو ضرب لگتی ہو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔

قنوطی جذبات کی ترجمانی نہ تو ہندوستانی اور نہ عرب عورتوں کے کردار کے لحاظ سے مقتضائے حال کے مطابق ہے اور نہ موقع و محل کے لحاظ سے۔"

(۳) اردو مرثیوں میں روایات ایک گورکھ دھندہ بن کر سامنے آتی ہیں...... مرثیہ گویوں نے بہتیرے واقعات ایسے نظم کیے ہیں جن کا تاریخ اور حقائق سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہا ہے...... اس پرواز تخیل اور اقتضائے حال کی مناسبت کا نتیجہ

یہ ہوا کہ مرثیہ گوئی میں مرثیہ کم اور تعزیت زیادہ ہوتی چلی گئی اور واقعات کربلا پر
افسانوی رنگ چڑھتا چلا گیا۔ قاری کے سامنے واقعات کربلا، واقعات اور حقائق
سے زیادہ افسانہ اور فکشن بن کر آنے لگے۔

(۴) مرثیہ گویوں نے معرکۂ کربلا میں حصہ لینے والے کرداروں میں سے بہت ہی
کم کرداروں کا ذکر کیا ہے۔ بنی ہاشم میں سے اکثر چھوٹ گئے اور اصحاب میں سے
صرف حُرّ ریاحی پر مستقل مرثیے کہے گئے۔ ان کا ارشاد ہے:۔

"حضرت امام حسینؑ کے آخری خطبے سے متاثر ہو کر اشقیا کی رفاقت چھوڑ کر امام
کی طرف آنے والے کم از کم تیس چالیس نفر تھے جن میں سے اردو مرثیوں کے افراد میں
صرف حضرت حُر ہی ایک فرد بن سکے ...... اس یلغار کے سلسلے میں یکے بعد دیگر
روایاتی اور واقعاتی حیثیت سے حسب ذیل افراد قاری کے سامنے آتے ہیں۔ ان میں
سے انفرادی طور پر اردو مرثیوں میں حضرت امام حسینؑ، حضرت عباس ابن علی، جناب
عون و محمد، جناب قاسم بن حسن، جناب علی اکبر، علی اصغر، حضرت سکینہ، جناب
فاطمہ کبریٰ، حضرت زینب کے علاوہ شاذ و نادر ہی کوئی اردو مرثیوں میں جگہ پا سکا ہے۔

اس سلسلہ میں انھوں نے دو نسوانی کرداروں پر مرثیے نہ لکھے جانے پر اظہار تاسف
کیا ہے۔ وہ ہیں جناب وہب ابن عبداللہ کلبی کی والدہ ماجدہ اور ان کی زوجہ۔
آخر الذکر وہ واحد خاتون ہیں جو معرکہ کربلا میں شمر کے اشارے پر شہید کی گئیں۔"

پروفیسر اطہر علی فاروقی نے اپنے اس اعتراض کے سلسلے میں شہدا کے اکسٹھ نام گنوائے
ہیں۔ جن کا ذکر مرثیوں میں کیا جا سکتا تھا۔ انھوں نے بڑی تحقیق سے ان شہدا کے
نام کے ساتھ ساتھ ان کے قاتلوں کے نام اور کیفیت میں ان کے سن اور ان یزیدیوں
کی تعداد بھی دیدی ہے جو ان بہادروں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔

ان میں چند نمایاں شخصیتوں کے اسمائے گرامی مرثیہ گویوں کی اطلاع کے لیے
ہم نقل کر دینا مفید سمجھتے ہیں۔

اسمائے گرامی شہداء	قاتل کا نام	انکے ہاتھ سے مقتول یزیدیوں کی تعداد
۱۔ عابس بن شبیب شاکری	سنگ زنی سے شہید ہوئے	۶۱ یزیدی مارے
۲۔ غلام امام زین العابدین	قاتل نامعلوم	۵۲ یزیدی مارے
۳۔ یریر بن زید انصاری مدنی	ایضاً	۱۱۶ 〃 〃
۴۔ ابو عمر ہنشلی	عامر بن ہنشلی	۵۴ 〃 〃
۵۔ علی بن مظاہر اسدی	غلام شمر	۷۰ 〃 〃
۶۔ معلیٰ بن مظاہر اسدی	〃 〃	۶۴ 〃 〃
۷۔ محمد بن مطاع	〃 〃	۳۰ 〃 〃
۸۔ مسلم بن عوسجہ	عبداللہ بجلی	۲۰ 〃 〃
۹۔ حجاج بن مسروق	غلام ابن زیاد	۱۵ 〃 〃
۱۰۔ یحییٰ بن کثیر	〃 〃	۵ 〃 〃
۱۱۔ یحییٰ بن مسلم	〃 〃	۵۰ 〃 〃
۱۲۔ مبارک غلام حجاج	نامعلوم	۱۱۰ 〃 〃
۱۳۔ جون غلام ابوذر غفاری	غلام عمر سعد	تعداد کثیر
۱۴۔ قرۃ بن ابی قرۃ غفاری	تمیم کندی	۳۴ 〃 〃
۱۵۔ عمر بن خالد	نامعلوم	تعداد کثیر
۱۶۔ سوید بن عمرو بن مطاع	تمیم کندی	۱۲ یزیدی مارے
۱۷۔ وہب ابن عبداللہ کلابی	نامعلوم	کثیر تعداد
۱۸۔ بریر ہمدانی	یحییٰ بن عوس ضبی	۴۰ 〃 〃
۱۹۔ عبدالرحمٰن بن عقیل	عثمان بن خالد	۱۷ سوار
۲۰۔ عون بن عبداللہ بن جعفر بن عقیل	عبداللہ بن قطر طائی	۳ سوار ۱۸ پیادے مارے
۲۱۔ عبداللہ اصغر بن حسنؑ	ہانی بن ثبیت حضرمی	۱۴ یزیدی مارے

اس خواہش میں کہ یہ تمام شہداء بھی الگ الگ مرثیوں کے مستحق ہیں ہم اظہر علی فاروقی کے ہم نوا ہیں۔ لہٰذا ہم اسے اعتراض کی جگہ ایک تعمیری و اصلاحی تجویز تسلیم کرکے اس کا خیر مقدم کرتے ہیں"۔

اعتراضات کا مجموعہ:۔ اب اگر ہم تمام اعتراضات کو یکجا کرکے دیکھیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان میں سے بیشتر تو حالی کے اعتراضات کی تفصیل ہیں۔ اور کچھ اس بحث کا نتیجہ کہ آیا اردو مرثیہ اور بطور خصوص انیس کے مرثیے رزمیہ اور ڈرامائی نظم کی یونانی اور مغربی تعریف پر پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ اس تحت میں ایک حد تک ڈراما کی بحث بھی آجاتی ہے۔ اردو مرثیہ میں وہ اجزاء جو "خوانندگی" سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے پورے تاثر کو مرثیہ پڑھنے والے کی آواز، لب و لہجہ، چشم و ابرو کے اشارے، حرکات و سکنات اسے تمثیل سے مشابہ کر دیتے ہیں۔ غرض، اگر ان تمام اعتراضات کی مجموعی تعداد کو جو تقریباً ۲۲ ہے بغور دیکھا جائے تو وہ حقیقتاً چودہ پندرہ سے زیادہ نہ نکلیں گے۔ جواب کے لئے ان کا دہرانا غیر مناسب نہ ہوگا۔

۱ : مرثیہ کا اصل مقصد چونکہ رونا رلانا ہے۔ اس لئے سامعین اس کی شعری خوبیوں کی طرف دھیان نہیں دیتے۔ بقول حکیم الدین احمد "ہمیں مرثیے میں گویا ماتم ہی نظر آتا ہے۔ اس زار نالی کا عنصر مرثیے میں ضرورت سے زیادہ غالب نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر فاروقی نے اس مزید نکتہ کا اضافہ فرمایا ہے "کہ" مرثیہ کا مقصد محض رلانا ہے۔ اس کے علاوہ اور دوسرے قسم کے جذبات اس کے دائرے سے باہر ہوگئے۔ اور اسی لئے "واقعات جرأت و اخلاق سے زیادہ ان کی مظلومی پر زور" دیا جاتا ہے۔

۲ : سامعین کا یہ اعتقاد کہ معرکۂ کربلا میں حصہ لینے والے مافوق طاقت بشری رکھتے ہیں۔ کبھی ان کی پیروی اور اقتدا کرنے کا تصور ہی دل میں آنے نہیں دیتا۔ اور بقول حکیم الدین اس کے بیان میں وہ شاعرانہ حسن و صداقت ممکن نہیں جو رستم و سہراب کی خونی داستان میں ہے۔ اور بقول ڈاکٹر فاروقی مرثیہ کے کسی کردار کو انسان تو دیکھا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ وہ ہر گناہ کی بالاتر ہیں اس لئے انسانی جذبات

جن کا تصادم ہی ڈرامہ کی جان ہے۔ مراثی کے کردار میں نہیں دکھائے جاسکتے"

(۳) بقول حالی "مرثیے میں رزم بزم سراپا وغیرہ کو داخل کرنا اور شاعرانہ ہنر دکھانا مرثیے کے موضوع کے خلاف ہے"

(۴) اردو مرثیہ صرف واقعہ کربلا کے بیان سے مخصوص ہوگیا ہے۔ اس نے دوسرے موضوعات تلاش نہیں کئے۔ اس لئے اس کا میدان بلحاظ بیان و فلسفہ دونوں طرح بہت محدود ہوگیا ہے۔

(۵) اردو مرثیہ میں جو واقعات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں وہ بہت مختصر ہیں اور تاریخی حیثیت سے ان کے بہت سے اجزا مشکوک ہیں۔ مورخانہ احتیاط سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور مرثیہ گو اس کو بہت کچھ گھٹا بڑھا کر پیش کرتا ہے۔" اور بقول اطہر علی فاروقی "واقعات کربلا، واقعات اور حقائق سے زیادہ افسانہ اور اور فکشن بن کر آنے لگے ہیں"

(۶) واقعہ کربلا ایک مسلسل و مربوط نظم کی صورت میں نہیں بیان کیا گیا ہے۔ ہر مرثیہ بجائے خود مکمل تصور کیا جاتا ہے لیکن اس کی تکمیل ناقص ہے۔

(۷) اشخاص کی تعداد کافی ہے لیکن کسی کی شخصیت صاف نظر نہیں آتی۔ صحیح تصویر پیش کرنے کی جگہ صرف مبالغہ آمیز تشبیہات و استعارات سے کام لیا جاتا ہے اور مبالغہ کی دنیا میں اس ٹوپی کو ہر سر پر منڈھ دیا جاسکتا ہے۔

(۸) مرثیہ میں "زندگی اس طرح پیش ہو ہی نہیں سکتی جیسی ناول، ڈرامہ ایپک وغیرہ میں پیش کی جاتی ہے۔

(۹) یورپ میں حزنیہ ادب کا مقصد رلانا نہیں، بلکہ دکھے ہوئے دلوں کو تسکین دینا ہے۔ اس لحاظ سے مرثیہ ان اصناف کے دائرے سے بالکل باہر ہو جاتا ہے، جو شعریات میں شامل کی جاتی ہے اس کا شمار پست عوامی ادب ہی میں ہو سکتا ہے۔"

(۱۰) مرثیہ نگاری مداحی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہماری شاعری کی عام روایات کی بنا پر ہر شخص خواہ وہ طبقہ عوام سے تعلق رکھتا ہو یا خواص سے، مدح سرائی ہی کو شاعری سمجھتا تھا جس میں عنصر غالب مبالغہ آمیز ادراک کا ہے.....

اُن کی مرثیہ نگاری یکسر قصیدہ نگاری ہے"

(۱۱) "مدّاحی اور بین نگاری .... دونوں متضاد چیزیں ہیں ..... مگر مرثیوں میں بھی (ان دونوں میں) ربط قائم کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی" یہی حال بزم نگاری کا ہے "بین نگاری بزم نگاری ہی کے دائرے میں آجاتی ہے اور بزم نگاری کا تین چوتھائی حصّہ سے زیادہ بین ہی کے دائرے میں آجاتا ہے"۔

(۱۲) مرثیے کے مختلف اجزا بالکل غیاوٹی ہیں اور ان میں کہیں کوئی تاثراتی وحدت (UNITY OF IMPRESSION) نہیں پائی جاتی۔

(۱۳) کردار نگاری مختلف نفسیاتی جزئیات کو ملا کر ایک کل کی تخلیق ہے ...... مرثیوں میں بھی جزئیات ہی پر زیادہ زور ہے۔ لیکن جب ہم ان جزئیات کو ملا کر ایک کل بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو ناکامیاب رہتے ہیں"

(۱۴) مرثیہ گویوں نے معرکہ کربلا میں حصّہ لینے والے کرداروں میں سے بہت ہی کم کرداروں کا ذکر کیا ہے۔ اور معرکہ میں شہید ہونیوالی واحد خاتون تک کو بھول گئے ہیں۔

(۱۵) مرثیے کے کردار عرب سے زیادہ ہندی بن گئے ہیں۔ مزید برآں بہ قول اظہر فاروقی "ضوطی جذبات کی ترجمانی نہ تو ہندوستانی اور نہ عرب عورتوں کے کردار کے لحاظ سے مقتضائے حال کے مطابق ہے اور نہ موقع و محل کے لحاظ سے"۔

باب دوم

جوابات

باب اوّل میں ہم نے وہ تمام اعتراضات پیش کر دیئے جو اردو مرثیے پر وارد کئے جاتے ہیں یا اب بھی وارد کئے جاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ نظرِ غور سے ملاحظہ کریں گے تو دیکھیں گے کہ ان سارے اعتراضات کی بنیاد ہی ایک اہم غلط فہمی پر مبنی ہے۔ معترضین اردو مرثیہ کو یا تو عربی و فارسی کی تعریفِ مرثیہ پر جانچتے ہیں اور ان زبانوں کے مرثیوں سے اسے ایک الگ چیز پا کر اس پر اعتراض کرتے ہیں یا وہ مغربی ایپک، ڈراما، اور ناول کے اصول پر اسے پرکھ کر اس کی کمیاں محسوس کراتے ہیں حقیقۃً وہ مرثیہ جو معرضِ بحث میں ہے نہ عربی و فارسی کی تقلید میں وجود میں آیا اور نہ وہ ایپک اور ڈراما کی تکنیک کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا گیا۔ وہ ان تمام اصنافِ سخن سے ایک جدا صنفِ شاعری ہے۔ اور یہ زبان اردو کی خاص دین ہے، اس کا مخصوص عطیہ! آفاقی شاعری میں ہماری زبان کی جانب سے ایک نئی صنفِ سخن کا ایک پائیدار، جاندار اور حسین و جمیل اضافہ۔

اردو مرثیہ ایک ایسی بیانیہ نظم ہے جس میں مشرقی غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ کے اجزا بھی ملیں گے اور مغربی ایپک، ڈراما اور نظم بھی۔ اس میں واقعاتِ کربلا کی مسلسل منظوم بیانی بھی ہے اور اس شہادتِ عظمیٰ میں شریک ہونے والوں کے کردار و سیرت کی مرقع کشی بھی، ان کے مجاہدہ و محاربہ و مکالمہ کی نقشہ کشی بھی اور ان کی شہادت پر بین اور گریہ وزاری بھی۔ اس کا مقصد ان عظیم ہستیوں کے کارناموں کے بیان سے یہ ہے کہ ان مرثیوں کے سننے والوں اور پڑھنے والوں کو اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دی جائے۔ ان کو ظلم و تعدی کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی ہمت دلائی جائے ان میں اصول و حق پرستی کی حمایت میں بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے کا جذبہ بیدار کیا جائے اور ہم میں بڑی سے بڑی مصیبت اور بلا کو بہ صبر و شکر برداشت کرنے اور جھیل جانے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ اس میں بینیہ اور رثائی عناصر پر خاص طور سے اس لئے زور دیا گیا ہے کہ ان کے ناظرین و سامعین میں رقتِ قلب اور گدازِ دل پیدا ہو جائے۔ جس کے ذریعے وہ اچھے انسان بنیں۔ کبھی کسی پر ظلم و جبر نہ کریں۔ ان تمام اوصافِ حسنہ کی پیروی کریں جنھیں ہم "حسینیت" کہتے ہیں

اور ان سارے افعال قبیحہ سے اجتناب کریں جنھیں "یزیدیت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

پس منظر: اس "حسینیت" اور "یزیدیت" کے فرق کو سمجھنے کے لیے بہتر ہوگا کہ مختصراً واقعہ کربلا کے پورے تاریخی پس منظر سے بھی واقفیت حاصل کر لی جائے۔ وہ یوں ہے:

امام حسینؑ اسلام کے بانی رسول مقبول حضرت محمد صلعم کے حقیقی نواسے اور وارث تھے اور خاتم النبیینؐ کی آغوش میں تربیت پانے کی وجہ سے اپنے عہد کے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ اسلامی شریعت و احکام کے جاننے اور برتنے والے۔ ادھر شام میں یزید بن معاویہ جو وہاں کا حاکم اور ایک طرح بادشاہ تھا وہ اس کا دعویدار تھا کہ "میں خلیفۂ رسول ہوں"۔ حسین جتنے دیندار، صاحب ایمان، متقی، پرہیزگار، عالم و فاضل، اوامر و نواہی کے پابند اور معلم و مفسر قرآن پاک تھے۔ اتنا ہی یزید اصول اسلام سے ناواقف، اس کے احکام کے خلاف عامل، ہر طرح کے نواہی کا مرتکب، بانی اسلام اور ان کے لائے ہوئے دین کا زبانی طور پر مدعی مگر حقیقتاً ان کے خاندان اور ان کے قائم کئے ہوئے مذہب کا دشمن، برسر منبر، بالاعلان بنی ہاشم کا استہزا کرنے والا، فسق و فجور میں گرفتار، شراب خوار، اوباش و رند منش تھا۔ لیکن اس کے پاس بادشاہت اور حکومت کے سارے وسائل تھے۔ اس نے ملک کے مختلف حصوں میں ایسے حاکم اور گورنر مقرر کر رکھے تھے جو ہر ایک سے زبردستی اس کی بیعت لیتے تھے اور اُسے خلیفۂ رسول تسلیم کراتے تھے۔ کوئی جان کے ڈر سے، کوئی زر و مال اور عہدے کی لالچ میں اُسے خلیفہ تسلیم کر لیتا تھا۔ نہ مانا تو حضرت حسین ابن علی اور ان کے چند اعزا اور احباب خاص نے۔ یزید نے حاکم مدینہ کو جہاں امام حسین مقیم تھے حکم بھیجا کہ انھیں بیعت کرنے پر مجبور کرو۔ اور اگر نہ مانیں تو قتل کر دو۔ جب حاکم مدینہ نے امام حسین کو اس کی اطلاع بھیجی تو آپ نے نہ صرف انکار بیعت کیا بلکہ وطن کا قیام ترک کر کے مکہ معظمہ کی راہ اختیار کی۔ حج کا زمانہ قریب تھا۔ امام حسینؑ کو خیال تھا کہ مکہ میں خونریزی شرعاً ممنوع ہے، اس لئے آپ کی جان اس مقدس فریضہ کے ادا کرنے کے سلسلے میں محفوظ رہے گی۔ لیکن یزید نے وہاں بھی اپنے آدمی بھیجے

کہ حرم کے اندر ہی امام کو موقع ملنے پر ضرور قتل کر دیں۔ امام کو اس کی اطلاع مل گئی، اور آپ نے حرم کو خونریزی سے بچانے کے لئے۔ فریضۂ حج کو ناتمام چھوڑ کر کوفہ کی طرف کوچ کیا۔ کوفہ وہ مقام تھا۔ جہاں آپ کے والد محترم حضرت علی خلیفۂ چہارم کی حیثیت سے کئی سال حکومت کر چکے تھے اور جہاں کے رؤساء اور سردار آپ کو بلا رہے تھے۔ اور کئی سو خط اس سلسلے میں پہونچ چکے تھے۔ پھر بھی اس امر کی تصدیق و تفتیش کے لئے کہ اہل کوفہ آپ کی آمد کے کس حد تک سچے دل سے مشتاق ہیں۔ امام حسین نے اپنے چچا زاد بھائی مسلم ابن عقیل کو اپنا نائب اور سفیر بنا کر پہلے سے کوفہ روانہ کر دیا لیکن یزید کے حکم سے ابن زیاد ایک ہزار لشکر لے کر کوفہ پہنچ گیا۔ اور اس نے حضرت مسلم اور ان کے دو خورد سال بچوں کو جو ان کے ساتھ گئے تھے قتل کرا دیا۔ اور ان کے میزبانوں اور حامیوں کا پتہ لگا کر قتل کر ڈالا یا قید کر دیا۔ اسی کے ساتھ اس نے اپنے ایک بڑے فوجی افسر حر ریاحی کو ایک ہزار سواروں کا رسالہ دے کر امام حسین کو راہ میں گھیرنے کے لئے بھیجا اور حکم دیا کہ انہیں کوفہ بے آب و گیاہ راستوں سے لاؤ اور کہیں اور نہ جانے دو چنانچہ حرؓ نے ایسا ہی کیا۔

اس نے دوسری محرم کو امام کو اس مقام پر قیام کرنے پر مجبور کیا جس کا نام نینوا اور کربلا تھا۔ اس جگہ ایک چھوٹی سی نہر یا ندی بہتی تھی جس کا نام فرات تھا۔ حرؓ نے اجازت دیدی کہ آپ کے ساتھ چونکہ عورتیں اور بچے بھی ہیں اس لئے آپ اپنے قیام دریا کے کنارے برپا فرمائیے۔ مگر ابھی قیام استادہ بھی نہ ہونے پائے تھے کہ ابن زیاد کا فرستادہ ایک نیا لشکر وہاں پہونچ گیا۔ اور اس نے امام کے خیمے لب دریا سے اکھڑوا دیئے۔ اور جلتی ریت پر فرات سے دور انہیں استادہ کرنے پر امام کو مجبور کیا۔

اب کوفہ اور اطراف کوفہ سے برابر یزیدی لشکر کی کمک پر کمک آنی لگی اور ان سب کا سردار عمر ابن سعد بھی آگیا۔ اس نے آتے ہی فوج کو پھیلا کر امام حسین اور ان کے عیال و اطفال و اصحاب کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ابتداء میں حر بن ریاحی کی کوششوں کے زیر اثر

ابن سعد بھی خونریزی سے پرہیز کرنا چاہتا تھا۔ مگر ابن زیاد کا قطعی حکم آیا کہ صلح کی کوئی شرط نہ منظور کی جائے۔ بیعت پر اڑے رہو۔ ورنہ جنگ۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق آپ پر روز بروز سختیاں بڑھائی جانے لگیں۔ اور بیعت کے اصرار میں شدت آگئی۔ مگر نواسۂ رسولؐ اپنی بات پر اڑے رہے۔ انہوں نے یزید کو خلیفۂ رسول تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے اپنے اصول کے لئے ہر طرح کی قربانی پیش کرنے کا عزم بالجزم مدینہ ہی سے کر رکھا تھا۔ وہ اپنی ہی نہیں بلکہ محبوب ترین اعزا اور رفقا کی شہادت کے لئے اور تاراجی خیام و اسیری و تشہیر خواتین خانوادۂ رسول کے لئے بھی تیار ہو بیٹھے۔

ساتویں محرم کی شام کو ابن زیاد کا سب سے زیادہ شقی القلب سردار شمر۔ ایک اور فوج لے کر آیا اور یہ قطعی حکم کہ قتل امام میں اب زیادہ پس و پیش کی ضرورت نہیں۔ چونکہ امام اور ان کے ساتھیوں کی جواں مردی و بہادری کا سکہ ہر ایک کے دل پر جما ہوا تھا۔ اسلئے ان جری صاحبانِ تیغ کو کمزور کرنے کے لئے شمر نے آتے ہی امام حسین ان کے اصحاب انکے عیال اور چھوٹے چھوٹے بچوں تک پر پانی بند کر دیا۔ نویں محرم کو امام نے اپنے تمام اعوان و انصار و اعزا کو مخاطب کر کے سمجھایا کہ انہوں نے طے کر رکھا ہے کہ وہ اسلام کو فسق و فجور سے بچانے کے لئے اپنی جان دیدیں گے۔ مگر یزید جیسے عیاش و شرابی کو خلیفۂ رسول نہ تسلیم کریں گے۔ اسلئے ان کی خواہش ہے کہ وہ لوگ جن کو ان کے اس عزم سے اختلاف ہو یا وہ لوگ جو اپنی دنیوی ضرورتوں کی وجہ سے اس وقت جان دینا نہ چاہتے ہوں وہ رات کے پردے میں کربلا سے کہیں دور چلے جائیں۔ مگر وفا کیش اصحاب و اعزا نے بہ یک آواز کہا کہ وہ اگر ستر بار بھی مارے اور جلائے جائیں تو بھی وہ امام حسین کا ساتھ نہ چھوڑینگے۔ چنانچہ رات بھر ان مجاہدوں نے عبادت خدا میں بسر کی اور صبح سویرے ہی سے سرفروشی کے لئے تیار ہو کر میدان جنگ میں آگئے اس وقت سے یہ لڑائی عصر تک جاری رہی یعنی تقریباً چار بجے سہ پہر کو شہادت امام حسین پر ختم ہوئی۔

بعض لوگوں کو تعجب ہوگا کہ مٹھی بھر جانبازوں نے جنکی تعداد سو کے لگ بھگ تھی اور جو عام طور پر بہتر بتائی جاتی ہے تقریباً تیس ہزار کے جرار لشکر کا اتنی دیر تک کیونکر مقابلہ کیا۔ تو ان کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ امام کے چھوٹے سے لشکر میں بیشتر افراد ایسے تھے جو اپنی تیغ زنی کے لئے عرب بھر میں مشہور تھے

اور لڑائی کا عام دستور اس وقت یہ تھا کہ ایسے سورماؤں کے مقابلے میں ایک ایک کرکے دشمن کے مشہور ترین صف شکن آتے اور جب اس طرح کے کوئی پہلوان ایک ہی آدمی کے ہاتھ سے قتل ہو جاتے اور کسی میں اکیلے مقابلہ کی ہمت نہ رہتی تو پوری فوج اُسے گھیر کر حملہ کرتی اور اس پر تیر باراں کرکے اور سنگسار کرکے حد درجہ مجروح کرکے قریب آکر قتل کر دیتی۔

بہر نوع عصر کے وقت جب امام حسینؑ نے اصول و حق پرستی کے لئے جام شہادت نوش فرما لیا تو اشقیا نے ان کے اور ان کے اعزا و خاص کے لاشوں کو پامال سُم اسپاں کیا، خیمہ ہائے مقدس میں آگ لگا دی اور آل رسول کے سروں سے چادریں تک چھین لیں۔ اور امام حسینؑ کے نحیف و زار بیمار صاحبزادے، علی اوسط سید سجاد زین العابدین کو طوق و سلاسل پہنا کر اور بیبیوں کو بے کجاوہ و محمل اونٹوں پر سوار کرا کے بہادرے شتر بانی کرائی اور راستے بھر انھیں کوڑے مارتے ہوئے پہلے کوفہ ابن زیاد کے پاس لے گئے پھر دمشق یزید کے دربار میں جہاں ان کے سردار خلعت و جاگیر سے سرفراز کئے گئے اور آل رسول ایک سال تک ایک تاریک و تنگ محبس میں قید رکھے گئے۔ یہی المناک واقعات مجالس عزا میں بیان کئے جاتے ہیں اور شرکائے مجلس انھیں کو سن کر ماتم و گریہ کرتے ہیں۔

پہلے ان ایام عزا کی مدت صرف دس دن ہوتی تھی یعنی پہلی محرم سے دسویں محرم تک اور بارہ کو امام کے پھول کرکے یہ ختم کر دیئے جاتے تھے۔ لیکن نوابین اودھ نے جو شیعہ تھے اس مدت کو بڑھا کر ۸ ربیع الاول تک کر دیا اور اب ان ایام میں کوئی ہندی شیعہ شادی بیاہ یا کوئی خوشی کا کام نہیں کرتا۔

دلگیر و خلیق و ضمیر اسی نوابی دور کے مرثیہ گو تھے۔ ان کے زمانے میں مجالس میں عام طور سے پہلے سوز خوانی ہوتی تھی پھر واقعہ خوانی و نثر خوانی۔ سوز خوانی کے مرثیے صرف بنیہ ہوتے تھے۔ اس کی ابتدا ارخند مطلع پڑھے جاتے تھے۔ عموماً یہ مطلع چار مصرعوں والے قطعات ہوتے تھے، جن میں مدح ائمۂ اطہار ہوتی تھی یا واقعات کربلا میں سے کسی ایک کا کنایتہً ذکر۔ سوز خوان انھیں خاص لحن سے پڑھتے تھے

جس میں موسیقی کے کمالات کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ پھر کبھی کبھی کسی سلام کے چند شعر پڑھتے اور پھر اصل مرثیہ۔ ان تمام اجزاء سوزخوانی میں موسیقیت کا خاص خیال رکھا جاتا تھا اور ان کی دھنیں خاص طور سے بڑی دردانگیز رقت آور رکھی جاتی ہیں۔ چونکہ مذہب شیعہ میں موسیقی ناجائز ہے اس لئے علما و زہاد سوزخوانی کے خلاف تھے اور مجلسوں کے اس حصہ میں شرکت نہ کرتے تھے واقعہ خوانی و نثر خوانی کے حصے میں آتے تھے اس کی نثر کا حصہ رواج زمانہ کے مطابق مسجع و مقفیٰ ہوتا تھا اور اس میں درمیان درمیان میں مدحیہ یا رثائی نظمیں بھی ہوتی ہیں۔ واقعہ خواں و نثر خواں اس مرکب نثر و نظم کا اختتام مبکی بیانات پر کرتے تھے جس سے متاثر ہو کر اہل مجلس گریہ و بکا کرتے تھے۔ مجلسوں کی کامیابی اور ناکامیابی کا فیصلہ شدت و قلت گریہ کی بنا پر کیا جاتا تھا اور اب بھی یہی دستور رائج ہے۔

اب ذرا اس گریہ و بکا کے وجوہ بھی سن لیجئے! سوزخوانوں، نثر خواں، مرثیہ خواں اور مجلس عزائے امام حسینؑ میں شرکت کرنے والے عموماً شیعہ مسلمان ہوتے تھے۔ شیعہ اس روایت پر یقین رکھتے ہیں کہ حضرت رسول مقبول صلعم کے حیات ہی میں بحکم الٰہی امام حسینؑ سے ایک محضر شہادت پر دستخط کرایا گیا تھا اس دستخط کے وقت رسول اللہ کے علاوہ حضرت علیؑ، حضرت فاطمہ اور امام حسنؑ بھی موجود تھے حضرت فاطمہ کو بتایا گیا کہ امام حسینؑ کی شہادت کے وقت صاحب عبا اور آل عبا میں سے کوئی نہ موجود ہوگا یعنی نہ رسول اکرم زندہ ہونگے، نہ حضرت علیؑ نہ حضرت فاطمہ اور نہ حضرت حسنؑ اور امام حسینؑ اور ان کے اعزا و اصحاب کی شہادت پر گریہ کرنیوالوں کو نیزہ کی انی چبھا چبھا کر اور کوڑے مار مار کر اور طرح طرح کی اذیتیں دیکر ان کو رونے سے باز رکھا جائے گا۔ اس زمانہ کے عرب کے نزدیک کسی میت کی سب سے بڑی توہین یہ تھی کہ اس پر کوئی رونے والا نہ ہو۔ اس لئے جناب فاطمہ کو حد درجہ صدمہ ہوا اور انھوں نے رسول مقبول سے فریاد کی کہ اتنے بڑے کارنامے کرنے والے پر کوئی رونے والا بھی نہ ہو۔ یہ عظیم ترین مصیبت ہوگی اس وقت رسول کریم نے بیٹی کو بشارت دی کہ خداوند عالم ایک مخصوص ملت پیدا کریگا جو تا قیام قیامت مجالس حسینؑ برپا کرتی رہیگی اور امام حسینؑ اور شہدائے کربلا پر گریہ و ماتم کرتی رہیگی۔

ناقدین اور مرثیہ گو

یہ ایسے ناقدین جو اس گریہ و ماتم کو "زار نالی" کے نام سے موسوم کر کے اس پر طنز کرتے ہیں، یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ وہ حدود ادب سے نکل کر معتقدات کے وادی تیہ اس بحث کو لے جاتے ہیں۔ ہم کسی ادبی کارنامے کی قدر و قیمت متعین کرنے میں معتقدات سے بحث نہیں کرتے اور او ڈی سی۔ الیڈ، رامائن، مہابھارت، پیراڈائز لاسٹ الفزنو، کے مصنفین کے معتقدات سے بحث نہیں کی جاتی، ان کے ادبی محاسن پرکھے جاتے ہیں، اور چونکہ وہ ہر طرح ادبی معیار پر پورے اترتے ہیں اس لیے انہیں لافانی کہا جاتا ہے لہٰذا یہاں بھی یہ امر معرض بحث میں نہ آنا چاہیئے۔ کہ رونا اور رلانا کوئی فعل مستحسن ہے یا نہیں اور محض رونے رلانے کو مجلس حسینؑ کی غرض و غایت بنا لینا درست و صحیح ہے یا نہیں۔ یہ امر شیعہ مفکرین اور ذاکرین کے درمیان بہت دنوں سے موضوع بحث بنا ہوا ہو۔ یہاں اردو مرثیوں کے سلسلہ میں ہمیں بہرحال یہ تسلیم کر لینا پڑے گا کہ ہر مرثیہ گو مذہبی اور اعتقادی حیثیت سے یہ اپنا فرض اولین سمجھتا تھا کہ وہ سامعین کو خوب رلائے اور گریہ کی زیادتی اور کمی ہی کو وہ مجلس کی کامیابی یا ناکامی سمجھتا تھا، اس لیے کہ اس کی نظر میں یہی ما کل مجلس تھا۔

اقسام میر خلیق و میر ضمیر وغیرہ کے پہلے اردو مرثیہ بالکل عربی و فارسی کے ڈھنگ کا تھا اور اس میں صرف بینیہ اشعار ہوتے تھے اور ان اشعار کی تعداد بیش از بیش ۲۵ سے زائد نہ ہوتی تھی۔ میر ضمیر اور ان کے ہمعصروں نے مرثیہ کو ایسے مختلف طرح کے اجزا بڑھا کر اتنا کافی طویل بنا دیا کہ ان کے تحت اللفظ پڑھے جانے کے بعد، نہ سوز خوانی کی ضرورت باقی رہی اور نہ نثر خوانی کی۔ اب اگر ہم عصر حاضر تک اردو مرثیہ پر نظر ڈالیں تو ہمیں چار قسم کے مرثیہ ملیں گے۔ پہلی قسم تو وہ ہے جو دکنی شعرا کے مرثیوں سے شروع ہوئی اور سودا کے مرثیوں پر ختم ہوئی اور وہ جو آج سلام و نوحہ اور ماتم کی شکل میں ہمیں نظر آتی ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جو میر ضمیر اور ان کے دیگر ہمعصروں نے ایجاد کی اور جس کو انیس و دبیر و تعشق اور ان کے متبعین نے بام عروج پر پہنچایا۔ تیسری قسم وہ ہے جس کے

موجودہ عصر میں زیادہ رواج ہے۔ اس میں زیادہ کسی تکنیک کی پابندی نہیں کی جاتی بلکہ امام حسینؑ کی قربانی کی اہمیت اور ان کے سیرت و کردار کے محاسن نمایاں کئے جاتے ہیں یا دوسرے شہدائے کربلا کے ایمان و اعتقاد و فاکیشی کی روئداد بیان کی جاتی ہے اور واقعہ کربلا سے فلسفیانہ اور مفکرانہ انداز میں بحث کی جاتی ہے انہیں عام طور سے مرثیہ گو "مسدس" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس نئے مرثیے کے سرخیل نسیم امروہوی، ان کے بعد آل رضا، جوش ملیح آبادی، نجم آفندی، افسر لکھنوی، جمیل مظہری اور تبسم کرمانی ہیں۔ چوتھی قسم ان مرثیوں کی ہے جو ممتاز افراد یا اعزا و اقربا کی موت پر کہے گئے ہیں۔ اس کی ابتدا کا سراغ تو غالب کی دو غزلوں میں ملتا ہے ایک تو وہ جس کی ردیف ہائے ہائے ہے اور دوسری وہ جس کی "زلف" کوئی دن اور ہے"۔ اور جو عارف کے نام سے موسوم ہے لیکن حقیقتاً اس قسم کے مرثیہ کا اعلیٰ ترین نمونہ خود حالی کا مرثیہ غالب ہے اس قسم کو معراج کمال تک چکبست نے پہنچایا۔

اعتراضات عام طور سے اردو مرثیہ سے مراد قسم دوم ہی کے مرثیے لئے جاتے ہیں اور وہی ان تمام اعتراضات کا مورد ہیں۔ اس لئے جوابات بھی انہیں کو پیش نظر رکھ کر حقیقتاً دیئے جا رہے ہیں:

۱۔ پہلا اعتراض جو گریہ سے متعلق تھا اس کے وجوہ واضح کر دیئے گئے۔ اس کا تعلق معتقدات مذہبی سے ہے اس لئے اس پر حرف گیری کرنا حدود نقد سے آگے نکل جانا ہے۔ اب رہا حالی کا یہ ارشاد کہ "سامعین اس کی شعری خوبیوں کی طرف دھیان نہیں دیتے۔"

حقیقت واقعہ کربلا کے خلاف ہے۔ مرثیہ کے سامعین اس قدر ذوق شوق سے مراثی سنتے تھے کہ وہ ہر ہر مصرعہ اور ہر ہر لفظ کے حسن و قبح پر نظر رکھتے تھے اور ہیں۔ اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ جس طرح داد دینے میں سیر چشمی سے کام لیتے ہیں، اسی طرح بھولوں کا تو ذکر کیا۔ میر انیس اور مرزا دبیر تک کو بر سر منبر ٹوک دیتے تھے اور آج بھی یہی طریقہ رائج ہے۔"

الف: کلیم الدین صاحب اس پر چراغ پا ہیں کہ مرثیوں میں "زار نالی" بہت ہے"

ایک تو یہ عرض ہے کہ یہ مرثیے لکھے ہی اس لئے گئے ہیں کہ ان کے سننے والے روئیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میر انیس کے مرثیوں کے یا وحید و نفیس و تعشق و رشید کے مرثیوں کا اگر بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو بینیہ اشعار کی تعداد دوسری طرح کے اشعار سے ہر مرثیہ میں کم ہی نکلے گی ان بینیہ اشعار کو جزو غالب کہنا خود اپنی کم نظری کی دلیل ہے البتہ ان کا یہ ارشاد سوز خوانی کے مرثیوں کے لئے یقینی درست و بجا ہے۔ اس لئے کہ ان میں نہ رزمیہ اشعار کی گنجائش ہے اور نہ رزمیہ اشعار کی۔ مگر یہ بھی زیادہ تر انھیں مرثیوں کے بینیہ حصّہ کے منتخب بند ہوتے ہیں جو تحت اللفظ پڑھے جاتے ہیں۔

(ب) رہا ڈاکٹر فاروقی کا یہ اعتراض کہ مرثیہ کا مقصد رلانا ہے۔ غم کے علاوہ دوسرے قسم کے جذبات اس کے دائرے سے باہر ہو گئے۔ علم النفس سے لاعلمی کی دلیل ہے جب ہم کسی پر روتے ہیں تو ہم میں اس سے ہمدردی محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اسی کے ساتھ اس کی تاسی اور تقلید کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور ظلم کرنیوالوں کی طرف سے غصہ و نفرت کے جذبات اُبھر آتے ہیں۔ شکست پر ہنستے ہیں، خوشیاں مناتے ہیں اور مظلوم کی حالت پر افسوس اور رنج کرتے ہیں۔ مرثیہ کا دائرہ انھیں جذبات کے بیان کرنے اور انھیں متحرک کرنے تک ہی محدود نہیں بلکہ انسانی فطرت میں جتنے جذبات ملے جاتے ہیں۔ ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا جذبہ ہوگا جو کسی نہ کسی حد تک مرثیوں میں اپنا جلوہ نہ دکھاتا ہوگا ہاں صرف ایک حسینی جذبہ کا اس میں فقدان ہے۔ ظاہر ہے کہ تین دن کی بھوک اور پیاس میں، تلواروں، نیزوں، تیروں کی بوچھاریں اعزا، اقربا، اولاد و احباب کے خون میں تڑپتے ہوئے لاشوں کی موجودگی میں خود اپنی موت سر پر منڈلاتی نظر آئے میں۔ نہ یہ جذبہ اور ان کے ہمراہیوں میں پیدا ہو سکتا تھا اور نہ مرثیہ گو۔ اس کا ذکر کر سکتا تھا۔ صرف اس ایک جذبہ کے علاوہ سارے جذبات، محبت و اخلاص، جرات مردانگی، غیظ و غضب، حسد و نفرت، بغض و کینہ، دلاوری و بزدلی، بے وفائی، نمک حلالی و نمک حرامی، استقلال، ایثار و انکسار، خود فراموشی و خود نمائی، فرار و پامردی، نفس پرستی و نفس کشی، خود غرضی و قربانی وغیرہ وغیرہ ہر طرح کے جذبات کے مرقع مرثیوں میں موجود ہیں۔ اس لئے اردو مراثی کے متعلق یہ تحریر فرمادینا کہ غم کے علاوہ اور دوسرے قسم کے جذبات اس کے دائرے سے باہر ہو گئے، صریحی

طور پر ناقد کی جانب سے خود اپنی کم نگاہی کا اقرار اعلان ہے۔

۲۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ سامعین کا یہ اعتقاد ہے کہ کربلا کے واقعات میں حصہ لینے والے مافوق البشر طاقت رکھتے تھے، اس لیے ان کے اقتدار کا تصور دل میں نہیں آتا۔ اور بقول کلیم الدین اس کے بیان میں اس لئے حُسن نہیں پیدا ہوتا کہ دونوں طرف کے معرکہ آرار قوت میں برابر نہ تھے اور بقول ڈاکٹر فاروقی مرثیہ کا کوئی کردار انسانی دکھایا ہی نہیں جاسکتا، کیونکہ وہ ہر گناہ سے بالاتر ہے۔

حالی اور ڈاکٹر فاروقی کے اعتراضات اس لحاظ سے غلط ہیں کہ شیعہ عقیدہ کے مطابق کربلا میں صرف دو معصوم تھے۔ ایک تو امام حسین اور دوسرے امام زین العابدین یعنی علی اوسط ابن حسین یقینی ان کو مافوق البشر طاقتیں خدا کی طرف سے ودیعت ہوئی تھیں، لیکن انھوں نے اپنی اس طاقت و قوت و اختیار کا کسی موقع پر بھی مظاہرہ کیا ہو اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا اور نہ مرثیہ گویوں نے ان کے معجزات کرامات، یا خرق عادت جیسا کوئی امر ان حضرات کا ظہور پذیر ہوتے ہوئے بیان کیا ہے۔ امام حسین معمولی انسانوں کی طرح بھوکے پیاسے رہے، اصحاب و اعزا کی شہادت پر رنجور ہوئے اُنکی لاشیں خود ہی گنج شہیداں تک لائے اور وقت عصر خدا کے سجدے میں سر رکھے ہوئے پشت گردن سے ذبح کئے گئے۔ امام زین العابدین حد درجہ بیماری کی حالت میں گرفتار کئے گئے انھیں طوق و سلاسل پہنائے گئے، کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام تک ان پھوپھیوں کا ننگے سر کوچہ و بازار میں پھرایا جانا اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے، راہ بھر پشت اقدس پر تازیانے کھاتے رہے۔ کیا تمام امور مافوق البشر قوت کے مظاہرے کے دلائل ہیں؟

ان دونوں نوماؤں میں سے کسی نے اپنی غیر معمولی قوت و طاقت سے کام نہیں لیا یا مان لیا جائے حالی کا فرمودہ، صحیح نہیں۔ اب رہا کربلا کے شہدا سے کسی قسم کا گناہ سرزد نہ ہونے کا سوال تو ان دونوں مذکورہ اماموں کے علاوہ شہدا میں کوئی بھی معصوم نہ تھا۔۔ اور اس سے گناہ کا سرزد ہوجانا نہ تو ناممکن تھا اور نہ خلاف عقل خود حُر ریاحی کو دیکھیے! انھوں نے حکم ابن زیاد

سے امام وقت کو راستے میں گھیرا انھیں ہندوستان آنے تک کی اجازت نہ دی اور کربلا جیسی بے آب وگیاہ مقام پر پھیرے آیا۔ یعنی یہ افعال گناہ کبیرا تھے مگر شب عاشورہ وہ اپنے کئے پر پچھتایا، توبہ کی، ابن سعد کا ساتھ چھوڑا۔ اور امام سے معافی مانگ کران کی طرف سے جنگ کی اور شہید ہوا۔ روایتوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حر کے علاوہ تقریباً تین اشخاص فوج یزیدی سے، امام کی تقریر سننے کے بعد ٹوٹ کر فوج حسینی میں چلے آئے اور ان کی جانب سے آکر لڑے اور شہید ہوئے۔ غرض نہ مرثیہ گو سوائے امام حسینؑ اور امام زین العابدینؑ کے کسی کو خطا سے بری سمجھتے ہیں اور نہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ ان اصحاب سے گناہ سرزد ہونے کا امکان ہی نہ تھا اور نہ انھوں نے خود ان آئمہ معصومین سے اپنے مرثیوں میں کسی قوت مافوق البشر کا ذکر کیا ہے۔ اب رہا کلیم الدین صاحب کا اعتراض، تو تمام مرثیوں میں جہاں بھی حضرت قاسم، حضرت علی اکبر یا خود امام حسینؑ کی فوج یزیدی کی کسی ایک فرد سے جنگ بیان کی گئی ہے، وہ ایسے افراد تھے جو فوج عمرو بن سعد میں اپنی تیغ زنی، اپنی نیزہ بازی، اور اپنی قوت میں یکتائے زمانہ سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ جس حسن صداقت کی کلیم الدین صاحب کو تلاش ہے وہ اُردو مرثیوں میں موجود ہے اور ان کا ان حصص سے واقف نہ ہونا خود ان کی کمی مطالعہ کی دلیل ہے نہ کہ اردو مرثیہ میں نقص کی۔ آیندہ صفحات میں میرے قول کے ثبوت میں مختلف مرثیوں سے مثالیں ملاحظہ کیجئے!

۳۔ تیسرا اعتراض حالیؔ نے اسی لئے وارد فرمایا ہے کہ وہ عربی و فارسی کے اساتذہ کی مقرر کردہ تعریف مرثیہ سے سرمو انحراف نہیں پسند کرتے، میر ضمیرؔ اور ان کے ہمعصروں کا ایجاد کردہ مرثیہ یعنی عربی و فارسی مرثیوں سے مختلف چیز ہے اس لئے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا یہ خالص اردو کی دین ہے اور دنیائے نظم میں ایک نئی صنف کا اضافہ۔ جی چاہے اسے کسی نام سے موسوم فرمائیے۔ مگر اس نے اردو زبان کو آب حیات پلا کر بقائے دوام کی سند دلا دی ہے۔

۴۔ اُردو مرثیہ صرف واقعات کربلا کے بیان سے مخصوص نہیں اس میں مدینہ کے بھی حالات ہیں۔ حج کے ناتمام رکھنے کے وجوہ بھی۔ حُر ریاحی سے راہ میں ملاقات بھی مسلم بن عقیل

کی کوفہ میں آمد وبیعت وشہادت بھی عقد ووفات فاطمہ زہرا بھی، معراج ووفات رسول اللہ بھی، خیبر و احد کی جنگ بھی، چہاردہ معصومین کے سوانح حیات بھی خود رسول اکرم کے معجزات بھی اور ایسے سیکڑوں ایسے امور جن کا تعلق حق وصداقت، دین و ایمان اور اسلام اور اس کی تعلیمات سے ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ تمام موضوعات قصیدہ کی تشبیب جیسا کام دیتے ہیں اور مرثیہ ہمیشہ ختم ہوتے ہیں، شہادت حضرت علیؑ، وفات جناب فاطمہ، شہادت امام حسن۔ یا واقعات کربلا کے بیان پر، اس لئے کہ وہ مرثیہ ہیں اور مرثیہ کے آخری بندوں میں حزنیہ ابیات کا ہونا لازمی ہے۔ تاکہ مرثیہ گویوں اور ان کے سامعین کے عقیدے کے مطابق آنکھیں اشک آلود ضرور ہوں، اور ذاکرین وسامعین موعودہ اجر عظیم کے مستحق بنیں۔

غرض، نہ تو اردو مرثیہ کا بیان محدود ہے اور نہ اس کا فلسفہ۔ آخرالذکر لفظ سے اگر فلسفۂ الٰہیات مراد ہے تو وہ ہر بڑے مرثیہ گو کے کلام میں موجود ہے۔ اور اگر فلسفۂ شہادت مقصود ہے تو وہ شاد عظیم آبادی کے مراثی میں ملاحظہ ہو۔ اور آج کل کے مرثیہ گویوں یا زمانۂ حال کے مرثیہ گویوں نے تو اس موضوع پر جس قدر دقیق وعمیق نظر ڈالی ہیں اور پھر اپنے کلام میں ساری شعری خوبیاں بھی باقی رکھی ہیں وہ دنیائے ادب میں عدیم المثال ہیں۔"

۵۔ یہ اعتراض کہ مرثیوں میں بیان کردہ واقعات تاریخی حیثیت سے ہوبہو درست نہیں، اور انھیں گھٹا بڑھا کر پیش کیا گیا ہے بس اسی حد تک صحیح ہے کہ اردو مرثیہ گوئی تاریخی کتاب نہیں ہے اور نہ کوئی ناول، ڈراما، نظم یا ایپک، جو تاریخ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، کبھی بھی بالکل تاریخی ہو سکتا ہے۔ شکسپیر کے تاریخی ڈرامے ہوں یا اسکاٹ کے تاریخی ناول، یا فردوسی کا شاہنامہ ان میں سے کوئی بھی ہوبہو تاریخی واقعات کی تصویر نہیں ہے۔ ذرا انصاف فرمائیے مہابھارت اور رامائن کس حد تک تاریخ ہیں اور کس حد تک افسانوی؟ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ جب بھی منظوم صورت اختیار کرے گی یا ناول یا ڈراما کی شکل میں پیش کی جائے گی اور اس میں شاعری اور فن کاری سے کام لیا جائے گا کہ وہ تاریخ

کی بزم خشک رہ جائے گی اس لئے مرثیوں کا صرف تاریخ سمجھنا غلطی ہے۔ نہ کوئی مرثیہ گو اُسے تاریخ لکھنے کا مدعی ہے اور نہ کوئی شریکِ مجلس مرثیہ کو تاریخی بیان سمجھ کر سنتا ہے۔ ڈاکٹر فاروقی کے "عوام" تک مرثیوں کو تاریخ کی کتاب نہیں سمجھتے۔

مرثیہ گویوں نے واقعہ کربلا سے متعلق اکثر روایات کا مطالعہ ضرور کیا ہے۔ ان کا مقصد صرف اتنا ہے کہ وہ ان واقعات کو ادبی حسن کلام سے اس طرح پیش کریں کہ وہ سامعین کے دلوں میں جاگزیں ہو جائیں۔ اور ان کو ان شہدا کے اسوۂ حسنہ کی تاسی پر مائل کریں اور ان کے مصائب پر گریہ وزاری پر مجبور کریں۔ اس لئے ضعیف سے ضعیف روایت بھی جو انھیں اپنے کام کی دکھائی دی اُسے انھوں نے اپنے مرثیہ کا موضوع بنا دیا۔ مثلاً واقعہ عقد حضرت قاسم ابن حسنؑ ہی کو لے لیجئے۔ بقول مرثیہ گویوں کے جناب قاسم کا عقد عین عاشورۂ محرم کو فاطمہؑ کبریٰ بنت امام حسینؑ سے وقوع پذیر ہوا۔ اسی کے یادگار کے طور پر آج تک محرم میں اکثر مقامات پر مہندی اٹھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ تاریخی حیثیت سے یہ واقعہ درست نہیں۔ مگر ایرانیوں نے اسے خاصا سچی واقعہ سمجھ کر اپنی مجلسوں میں اس کا ذکر کیا۔ ہمارے مرثیہ گویوں نے بھی اس سے فائدہ اٹھایا اور آج بھی جب کہ تحقیق نے اسے غلط ثابت کر دیا ہے۔ بعض ذاکرین اس کے ذکر اور بعض عزادار اس کی یادگار منانے سے باز نہیں آتے۔ اس لئے صرف مرثیہ گویوں پر تاریخ سے عدول کا الزام عاید کرنا قرینِ انصاف نہیں۔ ادب کا فن کار اس معاملے میں قصوروار دکھائی دے گا۔ بلکہ خطیب و مقرر ذاکر و مبلغ بھی۔

چھٹا جو اعتراض کلیم الدین صاحب کی طرف سے وارد کیا گیا ہے اس کے دو جز ہیں۔ ایک تو یہ کہ واقعہ کربلا ایک مربوط نظم میں نہیں بیان کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ ہر مرثیہ بجائے خود ایک مکمل نظم سمجھا جاتا ہو۔" لیکن اس کی تکمیل خاصہ ہے۔

پہلے جز کے جواب کے سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اردو مرثیے کتابی صورت میں نہیں لکھے گئے۔ اور نہ مرثیہ گویوں نے انھیں ایک مسلسل بیان کی صورت

میں لکھنے کا قصد کیا تھا۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ یہ مرثیے مجالس عزا میں پڑھنے کے
لئے لکھے گئے۔ مجالس عزا عشرۂ محرم میں دن رات ہوتی ہیں اور لکھنؤ میں اب بھی
ہوتی ہیں۔ سامعین ان میں سے اکثر مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں اور انیسؔ و دبیرؔ جیسے
صاحبان کمال کو کم سے کم دس مجلسیں ضرور پڑھنا پڑتی تھیں اور مجلس کی کامیابی و ناکامی کا
انحصار گریہ و بکا کی زیادتی و کمی پر ہوتا تھا۔ اس لئے وہ مجبور تھے کہ ہر مرثیہ کے ختم پر بین کے
اشعار ضرور لکھیں، اگر وہ واقعات کربلا کو مسلسل بیان کرتے رہتے تو یہ بات پیدا نہ ہو سکتی
اس لئے گو انھوں نے امام حسینؑ کی مدینے سے روانگی، حج میں دشمنوں کی سازش قتل سے
اُسے ناتمام چھوڑنا، مکہ سے کربلا کی راہ تک کے واقعات، دوسری محرم سے شب
دہم تک، دشمنوں کی زیادتیاں اور امام کا صبر و شکر، پھر عاشور کے دن صبح سے عصر
تک کے واقعات، مختلف اصحاب و اعزا کی شہادت، خود امام کی شہادت، آل عبا
کی اسیری، دربارہائے ابن زیاد و یزید میں ان کی رسن بستہ حاضری، ان کی قید خانہ
میں زندگی، تربت کے بعد مدینہ واپسی، سب کچھ الگ الگ مرثیوں میں لکھدی ہیں۔ مگر
مگر نہ وہ اسے ایک مربوط مرثیہ بنانا چاہتے تھے۔ اور نہ حالات کا یہ اقتضا تھا۔ کلیم الدین صاحب
کی یہ خواہش کچھ نہ کچھ مسعود حسن رضوی ادیب نے "رزم نامہ انیسؔ" کے ذریعہ
اور جناب سرفراز حسین خبیرؔ نے رزم نامہ دبیرؔ مرتب کر کے پوری کر دی ہے۔ مسعود حسن ادیب
نے یہ رزمنامہ مراثی انیسؔ سے اور خبیرؔ نے مراثی دبیرؔ سے تیار کیا ہے۔ ادیب کا رزم نامہ ان
تمام واقعات پر حاوی ہے۔ جو ولادت امام حسینؑ سے شہادت تک ظہور میں آئے خبیرؔ
کے رزم نامہ میں نعت رسول سے ابتدا کی گئی ہے۔ اور امام حسینؑ کی طفولیت سے لیکر
شہادت تک کے واقعات پر اکتفا نہیں کی گئی ہے بلکہ اسرار حرم کی درباروں میں حاضری
اور قید سے چھوٹ کر مدینہ کی واپسی بھی بیان کر دی گئی ہے۔

دو تین سال ہوتے ہیں کہ حضرت اکمل منظر نگری نے "معرکہ کربلا" کے نام سے ایک
مثنوی تصنیف فرمائی ہے۔ جس میں انھوں نے مستند روایتوں کے حوالہ سے تقریباً سارے
وہ واقعات بیان کر دیئے ہیں جو یزید کی تخت نشینی سے لیکر شہادت امام حسینؑ

اور اسیری و رہائی اہلبیت اطہار تک پیش آئے۔

سید مصطفےٰ الحسین زیدی گھرؔ نے اپنی مثنوی " پیکار کربلا " میں ، جو زیر طبع ہے ، جناب آلمؔ سے بھی زیادہ اہم کام انجام دیا ہے ان کی مثنوی مرثیہ کی بحر میں ہے ، اور انھوں نے تاریخ و کتب سیر کے حوالے سے ہبوط آدم سے لیکر انتقام مختار تک کے واقعات بیان کئے ہیں ۔ ابتدائی حالات اجمالی ہیں ، مگر معرکہ کربلا کو انھوں نے بڑی شرح و بسط سے بیان کیا ہے اور اس سلسلہ میں چالیس سے زائد شہدا کی جنگ بالتفصیل لکھی ہے ۔

چنانچہ کلیم الدین صاحب کی یہ خواہش کہ واقعات کربلا ایک مربوط نظم کی صورت میں بیان کر دیئے جاتے ، ادیب اور رجبیؔ کے رزم ناموں اور آلمؔ و گھرؔ نے اپنی مثنوی کے ذریعہ پوری کر دی ۔

اب رہا ان کا یہ ارشاد کہ " ہر مرثیہ بجائے خود مکمل سمجھا جاتا ہے ، لیکن اس کی تکمیل فاسد ہے " تو ان کا یہ قول میرے خیال میں خود فاسد ہے ۔ وہ ہر شے کو ایک خود ساختہ جریب سے ناپنے کے عادی ہیں ۔ حالانکہ یہ جریب حد درجہ ناقص ہے وہ مغربی لکڑی کی بنی ہوئی ہے اور اس کی گرہیں ، کھڈے علامات و نشانات کہیں یونانی ہیں ، کہیں لاطینی ، کہیں فرانسیسی اور کہیں انگریزی ، اردو مرثیہ اس جریب سے ناپنے کی چیز نہیں ۔ مشرق و مغرب کی ساری اقسام نظم سے وہ ایک الگ شے ہے ۔ وہ ایک ایجاد ہے اور عام اقسام نظام میں ایک اضافہ اس کی تکمیل میں صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ میر ضمیرؔ کے ہمعصروں نے جو اس کے عناصر مقرر کئے تھے اور میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ نے جسے اپنے مرثیوں میں برتا اور معراج کمال تک پہنچایا ، آیا وہ مرثیہ ان پر پورا اترتا ہے یا نہیں ؟ اور میرا دعویٰ ہے کہ میر انیسؔ ، مرزا دبیرؔ ، میر عشقؔ ، میر تعشقؔ ، میر مونسؔ ، میر نفیسؔ ، میر انسؔ ، میر وحیدؔ ، مرزا اوجؔ ، پیارے صاحب رشیدؔ اور ان کے متبعین و مقلدین کے اکثر مراثی معیار پر پورے اترتے ہیں اور ان کی تکمیل ہرگز فاسد نہیں ، البتہ اس کی تکمیل کو دیکھنے کے لئے مغربی عینک آنکھوں سے اتارنی پڑے گی اور خالص ہندوستانی چشم بینا سے نظر ڈالنا پڑے گی ۔

۷۔ اشخاص کی تعداد کافی ہے لیکن کسی کی شخصیت صاف نظر نہیں آتی ۔ اس

اعتراض میں اگر شخصیت سے مراد شکل و صورت، چہرہ مہرہ ہے۔ تو یقینی یہ اعتراض بجا ہے۔ مرثیوں میں مجاہد کی صورت و شکل بیان کرنے کی جگہ مبالغہ آمیز تشبیہات واستعارات سے کام لیا گیا ہے۔ اور کسی کی شکل و صورت جیسی کہ وہ ہمیں تاریخی کتابوں میں ملتی ہے، نظر نہیں آتی۔ لیکن اگر شخصیت سے مراد عمر، سن و سال سیرت و کردار، چال ڈھال، گفتگو کا طریقہ اور اخلاق و عادات ہیں، تو کربلا کے ممتاز کرداروں کے بیان میں مرثیہ گویوں نے انھیں خاص طور پر واضح کرکے بیان کیا ہے، مثلاً حضرت عباس کے کردار میں وفا کیشی۔ امام حسین کے بھائی ہونے کے باوجود ہمیشہ اپنے کو غلام کہنا، امام پر پروانہ وار فدا ہوتے رہنا، امام کے عیال کی پردہ داری کا خیال رکھنا مزاج میں حد درجہ غیرت کا ہونا اور خلاف حمیت باتوں پر غیظ و غضب کا اظہار کرنا، طوالت قد کی وجہ سے اسپ دو دکا پر سواری کرنا، اور باوجود اپنے عالی مرتبہ ہونے کے اپنی بھتیجی سکینہ بنت حسین کے لئے سقائی کرنا پھر ان کا دلیری وجراءت و تیغ زنی میں یکتائے روزگار ہونے کے باعث علمبرداری و سرداری کے مرتبہ پر فائز ہونا، ان تمام خصوصیات کو مرثیہ گویوں نے اس قدر اجاگر کرکے پیش کیا ہے کہ ان کی شخصیت کا دوسرا کردار، کربلا میں نظر نہیں آتا۔ اسی طرح جناب عون و محمدؐ فرزندان جناب زینب کے کردار، کم سنی میں علمبرداری کے حوصلے، جنگ میں پیش قدمی کے ولولے، ماں باپ کی اطاعت، حضرت علی اکبر کی خدمت و رفاقت و حفاظت کی ذمہ داری، لڑتے وقت ایک دوسرے کی پشت پناہی ان کے کردار کی امتیازی خصوصیتیں ہیں۔ حضرت علی کا سرتاپا شبیہ رسول ہونا، رفتار و گفتار وآواز میں امام حسین اور ان کے رفقار کو جد امجد کی یاد دلاتے رہنا، پھر ان کی جوانی کے دلیرانہ و تہورانہ انداز، ایک بہت بڑے پہلوان سے جنگ کے بعد ان کی تشنگی کا عالم ایک بار میدان سر کر کے دوبارہ جنگ کے لئے جانا اور دھوکے سے شہید کیا جانا خود امام کی سیرت، یزید کی بیعت سے انکار کرنا، مدینہ سے مکہ جانا اور حج کو ناتمام چھوڑنا۔ اور حر اور اس کی فوج کو پیاسا نہ رہنے دینا، قدم قدم پر اصحاب و اعزا کے اصرار پر یہ فرمانا کہ وہ اپنی قربانی پیش کرنے جا رہے

ہر اور دوسروں کو انکے ساتھ جان دینے کی ضرورت نہیں۔ شب عاشور کا ان کا خطبہ، جنگ سے پہلے کا خطبہ،
جنگ سے پہلے ان کا وعظ، صبح سے ظہر تک ایک کے بعد ایک جاں نثار رفیق اور گود کے پالے کی شہادت کا غم
صبر و شکر سے برداشت کرنا، ہر لمحہ اپنی جان سے زیادہ دوسروں کا خیال رکھنا، ہر شہید کی لاش پر گرتے پڑتے خود
پہنچنا، اپنے ہاتھوں پر چھ ماہ کے بچے کو تیر سہ شعبہ سے ہلاک ہوتے دیکھنا، مافوق الفطرت طاقت و قوت و
قدرت ہوتے ہوئے بھی کسی موقع پر اس سے کام نہ لینا اور سجدۂ الٰہی میں اُمّت نبوی کے لئے دعائے مغفرت کرتے
ہوئے سر کٹانا۔ کیا اس سیرت کا کوئی اور شخص اس پورے معرکہ میں نظر آتا ہے؟

اسی طرح خواتین میں جناب زینب کی سیرت حد درجہ نمایاں ہے۔ مدینہ سے لیکر کربلا تک ہر اہم
موقع پر انکی شخصیت ماہتاب کی طرح چمکتی دکھائی دے رہی ہے۔ امام حسین کی محبت میں اپنا گھر بار اپنا وطن مدینہ
چھوڑا بھائی کی معیت کو شوہر کی رفاقت پر ترجیح دی۔ امام کے ساتھ ساتھ مدینہ سے مکہ، مکّہ سے کربلا خاک چھانتی
پہنچیں، پہلے ہی دن لب دریا سے خیموں کے ہٹائے جانے حضرت عباس کے غیظ کو انھیں محترمہ کی مصلحت پسندی
نے ٹھنڈا کیا۔ شب عاشور انھیں کی گفتگو نے اصحاب حسین کو بنا میں توڑ کر پھینک دینے کے تیور پر ابھارا، رات بھر بچوں
کو جعفر و علی کی دلاوری و سیف زنی کی داستانیں سنا کر انکے ننھے دلوں میں فولاد جیسی صلابت پیدا کر دی۔
صبح عاشورہ کو سویرے سے یہی فکر تھی کہ امام حسین پر سب سے پہلے انکے صاحبزدگان۔ عون و محمد ہی فدا ہوں
ان کے قتل گاہ میں دیر جانے پر غم و غصہ کا اظہار کیا، پھر اجازت ملنے پر انکو اسلحہ جنگ سے آراستہ کرتے وقت
ان سے ہمت و جرات دلانے والے فقرات کہہ کر انکے دلوں میں آزمودہ کار جنگ جویوں جیسا ولولہ آرائی
پیدا کر دیا، انکی شہادت پر ان کے خون میں ڈوبے ہوئے چہروں کو دیکھ کر خوش رہیں کہ مجھے معرکہ خاندان کی
بیبیوں میں سرخرو کیا، امام حسین ہی سے نہیں، بلکہ ان کے جوان بیٹے علی اکبر سے بھی بے پناہ محبت کی اور
اپنے بچوں سے بھی زیادہ عزیز رکھا۔ شہادت حسین کے بعد کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے دمشق تک بے مقنع و چادر
رسن بستہ کوچہ و بازار میں پھرائے جانے کی ذلت کو اس لئے برداشت کیا کہ انھیں مقاصد قربانی حسین عوام کو
سمجھانا تھے، راستہ بھر ہر شہر، ہر قریہ میں جہاں سے بھی یہ لٹا ہوا قافلہ گزرا حق و صداقت کی
تلقین و تبلیغ کی، بھرے دربار میں، گلے میں رسی کا پھندا پڑا ہونے کی حالت میں، شمر کے کوڑا تانے ہوئے کھڑا
ہونیکے باوجود یزیدیوں کی ننگی تلواروں کے بیچ، یزیدیوں کے منھ پر اُسے ظالم قاتل، دشمن ایمان و اسلام کہا، قید خانے

میں بیماروں کی تیمار داری اور بچوں کی دیکھ بھال کی۔ قید سے چھوٹنے پر سیدھے بھائی کے مزار پر کربلا تشریف لے گئیں، پھر وہاں سے مدینہ واپس ہونے پر عمر بھر صحن خانہ میں عبادت و ریاضت و مجلس حسین میں زندگی بسر کی۔ اور کبھی کسی چھت یا شامیانے یا درخت کے سائے میں نہ بیٹھیں نہ لیٹیں۔

کیا مرثیہ میں پیش کی ہوئی یہ شخصیتیں ڈاکٹر فاروقی کو نظر نہ آئیں؟ میں آئندہ صفحات میں مثالیں پیش کروں گا۔ وہ ملاحظہ فرمالیں۔

(۸) مرثیہ میں زندگی اس طرح پیش ہو ہی نہیں سکتی جیسی ناول، ڈرامہ، ایپک وغیرہ میں پیش کی جاتی ہے۔

یہ غالباً اس امر کے جواب میں لکھا گیا ہے کہ بعض انیس پرستوں نے ان کے مرثیوں میں رزمیہ عناصر کو بہ احسن دلفریبی پا کر اسے "رزمیہ" یا ایپک کہنا شروع کر دیا۔ اس خیال کی ابتدا نواب امداد حسین اثر سے ہوئی۔ پھر نواب جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی نے ڈاکٹر فاروقی کے اسی مضمون سے متاثر ہو کر جہاں میر انیس کے مرثیوں کی خوبیوں پر ایک کتاب لکھ ڈالی۔ وہاں انھیں رزمیہ اور ایپک بھی ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے اور ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری نے تو پورا ضخیم پی، ایچ، ڈی کا تھیسس ہی اس موضوع پر لکھ ڈالا ہے۔ مرثیوں کو ایک طرح کا ڈرامہ ثابت کرنے میں ڈاکٹر صفدر آہ سیتاپوری، مرثیہ گویوں کی خواندگی کی وجہ سے پیش پیش ہیں۔ علی سردار جعفری نے بھی ان کی کتاب کے مقدمے میں اس خیال کی تائید کی ہے۔ اردو مرثیہ کو کلیتاً ایپک یا ڈراما تسلیم کرنے میں یہ حقیر متفق نہیں۔ لیکن مجھے ان نامداران اردو ادب سے اس حد تک اتفاق ضرور ہے کہ مرثیہ میں ایپک اور ڈراما کے خاصے نمایاں عناصر پائے جاتے ہیں۔

مجھے جو کچھ بھی عرض کرنا ہے وہ ڈاکٹر فاروقی کے اعتراض کے اس حصہ سے متعلق ہے جس میں وہ بڑے طنطنہ کے ساتھ "ہو ہی نہیں سکتی" فرماتے ہیں۔ ایک جواب تو الزامی ہے۔ وہ یہ کہ پیراڈائز لاسٹ اینڈ ریگینڈ، ایپک ہے یا نہیں؟ گر ہے تو وہ دنیاوی زندگی کو کس حد تک پیش کرتی ہے۔ اور فاسٹ، اور

ڈیوائن کامیڈی، کس حد تک حقیقی انسانی زندگی پیش کرتے ہیں؟

اس جواب سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ عرض کرنا ہے کہ مرثیہ میں ایپک بنائے جانے کی پوری صلاحیت واہمیت موجود ہے۔ حبیب ابن مظاہر، مسلم ابن عوسجہ، زہیر بن قین، حُر ریاحی اور حضرت عباس علمدار پر پورا ایپک لکھا جا سکتا ہے۔ انیس کے ایک شاگرد فارغ سیتاپوری نے اس خدمت کو انجام دینے کے لئے آٹھ سو سے زائد بندوں کا ایک مرثیہ لکھ ڈالا تھا، مگر حیات نے وفا نہ کی۔ اور وہ اُسے نامکمل چھوڑ گئے انیس ہی کے ایک دوسرے شاگرد "موجودہ راجہ محمود آباد کے جد امجد، راجہ امیرالدولہ بہادر نے حضرت عباس کی ولادت سے لے کر شہادت تک کے واقعات پر ایک تمام مرثیہ لکھ ڈالا تھا جو ہماری بدنصیبی سے اب تک غیر مطبوعہ ہے۔ عہد حاضر میں جناب محسن جونپوری، جنھوں نے مرثیہ گوئی اپنے جد امجد ذوالقدر بہادر محسن ایک شاگرد انیس سے ورثے میں پائی ہے، واقعۂ کربلا پر ایک ایپک لکھ رہے ہیں۔ مؤلف ناچیز کی فرمائش پر اس کے ایک بزرگ سید غلام امام صاحب ایڈوکیٹ نے بھی حضرت عباس کی حیات وسیرت وکردار پر ایک ایپک لکھ ڈالا ہے جو زیر طبع ہے۔

بہرحال ڈاکٹر فاروقی کا یہ دعویٰ کہ مرثیہ میں ایپک کی طرح زندگی نہیں پیش کی جاسکتی ہے قابل قبول نہیں۔ سوائے جنسی معاملات کے ذکر کے مرثیہ اپنی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈال سکتا ہے اور کربلا کا ہر نمایاں شہید ایپک کا ہیرو بنایا جاسکتا ہے۔

اعتراض ۹-۱۰ (۱)

(۱) یورپ میں حزنیہ ادب کا مقصد رلانا نہیں بلکہ دکھے ہوئے دلوں کو تسکین دینا ہے اس لحاظ سے مرثیہ ان اصناف کے دائرے سے بالکل باہر ہو جاتا ہے جو شعریات میں شامل کی جاتی ہیں۔ اس کا شمار پست عوامی ادب ہی میں ہو سکتا ہے" فاضل انگریزی پروفیسر ڈاکٹر فاروقی کا ارشاد ہے۔

یہ اعتراض یورپ پرستی کا بین ثبوت ہے، ارسطو حزنیہ ادب کا مقصد کچھ بھی بتائیں، رونے والے المیہ داستانیں سن کر اور حزنیہ ڈراما دیکھ کر روتے بھی ہیں اور اس

کے لئے دُکھے ہوئے دل کی ضرورت نہیں۔ حال ہی میں امریکہ کے قلبی امراض کے ڈاکٹروں نے تحقیق کر کے ثابت کر دیا ہے کہ عورتوں میں مردوں کے مقابلے میں یہ امراض صرف اس لئے بہت کم ہوتے ہیں: وہ حزنیہ ڈراموں اور فلمیں دیکھ کر روتی ہیں یہ اشک فشانی ان کے دل کا بوجھ کم کر دیتی ہے اور اعصاب میں وہ تناؤ اور کھنچاؤ باقی نہیں رہتا جو قلب کے لئے حد درجہ مضر ہے۔

رہا یہ امر کہ مرثیہ دُکھے دلوں کو تسکین دیتا ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ تو اسی امر سے ہو جاتا ہے کہ شیعہ ہر عزیز کے مرنے پر مجلس حسین ہی کرتے ہیں اور بجائے اپنے عزیز پر رونے کے شہدائے کربلا ہی پر گریہ و بکا کرتے ہیں اور اسی ذریعے ان کے دُکھے ہوئے دل کی تسکین ہوتی ہے۔ مرثیہ بھی ان مجالس میں پڑھا جاتا ہے اور اس سے بھی دُکھے دلوں کو تسکین ہوتی ہے۔ مرثیہ کے سننے والوں میں تحمل، بردباری، استقامت، صبر، ایثار، وفا، قربانی، اصول سے نہ ہٹنے کا خیال، حق پرستی، حق گوئی کے جذبات ایسے لوگوں سے کہیں زیادہ اُبھرنے اور پھر درش پانے کے امکانات ہیں جنھوں نے مرثیوں کی "پست عوامی" ادب سمجھ کر نظر انداز کر رکھا ہے۔ جب بھی اس طرح کا امتحان کا وقت آئے گا آپ اس چھوٹی سی قوم گریہ کن کو اصول کے لئے اور مذہب کے نام پر قربانی پیش کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں پائیں گے۔ بقول صفی یہ "وقت آنے دو، وقت آئے ہم تم کو دکھا دیں گے"۔

اب رہا "پست عوامی ادب" والا حد درجہ دل آزار و تحقیری فقرہ، تو بہتر ہوگا کہ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر فاروقی کے ان زریں اقوال پر بھی غور کر لیا جائے:۔

(۱) مرثیہ بنیادی طور پر ادبی چیز بھی نہیں ہے۔

(۲) مرثیہ نگاری مداحی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مرثیہ نگاری ایک قصیدہ نگاری ہے۔

(۳) مداحی اور بین نگاری —— دونوں متضاد چیزیں ہیں۔ مگر مرثیوں میں کبھی ان دونوں میں ربط قائم کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی ہے ......

... رزم نگاری کا تین چوتھائی حصہ زیادہ بین ہی کے دائرے میں آ جاتا ہے"

مجھے ڈر ہے کہ اگر میں ان غیر ادیبانہ اعتراضات کا جواب دوں گا تو میرے

لہجہ میں تلخی پیدا ہو جائے گی۔ اس لئے اردو مرثیہ پر سب سے پہلے اعتراض کرنے والے مولانا حالی ہی سے ان اعتراضات کا جواب سن لیجئے۔ حالی فرماتے ہیں۔ "

عرب کی قدیم شاعری میں قصائد اور مرثئے ایسے پکے اور صحیح حالات و واقعات پر مشتمل ہوتے تھے کہ ان سے متوفی کی مختصر لائف استنباط ہو سکتی تھی۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِ بزرگوار عبد المطلب کے مرثئے جتنے لکھے گئے ہیں۔ سب میں تھوڑے تھوڑے تفاوت سے ان کی عشیرہ پروری، قومی ہمدردی اور قوم کی مشکلات اور مصائب میں سینہ سپر ہونے کی تعریف کی گئی ہے۔

حذیفہ بن خانم نے جو اسی بن غالب ہی کی نسل سے تھا۔ عبد المطلب کے مرثیہ میں اس احسان کا بھی ذکر کیا ہے کہ جب وہ خود چار ہزار درم قرضہ کی بابت مکہ میں پکڑا گیا تو ابو لہب ابن عبد المطلب نے اس کو جا کر قرض خواہوں کے پنجے سے چھڑایا تھا۔ اسی طرح عرب کے اکثر قصائد اور مراثی حقائق و واقعات پر مشتمل پائے جاتے تھے۔

غرض مولانا حالی کے بیان سے یہ تو ثابت ہی ہو گیا کہ مرثیہ نگاری اور مداحی دو مختلف چیزیں نہیں۔ مرثیہ وہ قصیدہ ہے جو کسی مردہ شخصیت کی مدح میں کہا جائے۔ دوسرے یہ کہ وہ اسی طرح بنیادی طور پر ادبی "چیز ہے۔ جس طرح قصیدہ۔ اگر شعری ادب میں جو خوبیاں پائی جانا چاہئیں ان پر نظر رکھی جائے اور ان کے معیار پر مرثیہ کو خاص طور سے مراثی انیس کو جانچا، تولا اور پرکھا جائے تو وہ ہر طرح پورے اتریں گے۔ مولانا شبلی کا موازنۂ انیس و دبیر اس طرح کے معترضین کا دندان شکن جواب ہے۔

اصلیت عوامی ادب " کو مولانا حالی جو عربی شاعری کو ہر صنف سخن میں اردو شاعری سے افضل و برتر سمجھتے ہیں کس معیار کی چیز سمجھتے ہیں۔ وہ انھیں سے سنئے۔ ان کا ارشاد ہے:-

اس خاص طرز کے مرثیہ کو اگر اخلاق کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی ہمارے نزدیک اردو شاعری میں اخلاقی نظم کہلانے کا مستحق صرف انھیں لوگوں کا کلام

ٹھہر سکتا ہے بلکہ جس اعلیٰ درجہ کے اخلاق ان لوگوں نے مرثیہ میں بیان کئے ہیں ان کی نظیر فارسی بلکہ عربی شاعری میں بھی ذرا مشکل سے ملے گی۔

ان مرثیوں سے کیسے اعلیٰ اخلاق کی تعلیم حاصل ہوتی ہے اس کا بیان بھی انہیں حالی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے گا اور انھیں "پست عوامی ادب" کہنے اور سمجھنے والوں سے میرے ساتھ اقرار فرمائیے کہ وہ اس سوء ادب پر شرمندہ ہوں حالی کا ارشاد ہے۔ "فضائل اخلاق کا نمونہ اس سے اعلیٰ اور اشرف اور کیا ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے نبی کے نواسے جس کے آگے ہر مسلمان کا سر جھکنا چاہیے تھا اور جس کو ان سے بے انتہا امیدیں ہونی چاہیے تھیں وہ چند عزیزوں اور دوستوں کے سوا ہر مسلمان کو اپنے خون کا پیاسا دیکھتا ہے۔ ریگستان عرب کی لو اور گرمی اپنے۔ عورتیں، صغیر سن بچے اور سارا کنبہ ہمراہ ہے، مدینہ سے کوفہ تک ہینوں کی راہ طے کرنی ہے جو اعوان و انصار بن کر ساتھ چلے تھے ان میں سے چند کے سوا سب ساتھ چھوڑ چھوڑ کر چل دیئے ہیں۔ جن لوگوں نے متواتر خط اور پیغام بھیج کر اور خدا اور رسول کو درمیان دیکر نصرت دیاری کے وعدوں پر بلایا تھا وہ ان کو آکر یک قلم منحرف و برگشتہ پاتا ہے اور تمام امیدیں مبدل بہ یاس ہو گئی ہیں با ایں ہمہ وہ راضی برضا ہے۔ ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور اپنے ارادہ پر ثابت قدم ہے۔ جس شخص کے تسلط کو، ملک اور قوم اور دین کے حق میں ایک مرض مہلک سمجھ کر اس کی بیعت سے انکار کر چکا ہے۔ باوجود ان تمام شدائد کے اپنے انکار پر اسی طرح قائم ہے۔

دشمنوں نے کھانا اور پانی سب بند کر رکھا ہے اور دریائے فرات آنکھوں کے سامنے بہہ رہا ہے، دشمنوں کے گھوڑے، گدھے اور اونٹ تک اس سے سیراب ہوتے ہیں مگر اس کا سارا کنبہ تین روز سے پیاسا ہے۔ اس کے ننھے ننھے بچے پانی کی ایک ایک بوند کو ترستے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس لئے کہ ایک نالایق آدمی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرتا۔ باایں ہمہ وہ اپنے ارادہ پر اسی طرح ثابت قدم ہے۔ کسی سختی اور کسی مصیبت سے اس کے استقلال میں فرق نہیں آتا۔"

اس کے یار و مددگار کل ستر دو بہتر آدمی ہیں اور ایک ٹڈی دل سے مقابلہ ہے،
لڑنے میں اپنا اور سب عزیزوں اور دوستوں کا خاتمہ نظر آتا ہے۔ خیمہ اور اسباب
کا لٹنا، باقی ماندوں کا اسیر ہونا۔ عورتوں کی بے ردائی اور بادیہ پیمائی، یہ سب
آفتیں گویا آنکھ سے دکھائی دیتی ہیں۔ مگر وہ ان سب کو گوارا کرتا ہے اور بہتر
سمجھتا ہے بہ نسبت اس کے کہ ایک نالائق آدمی کے ہاتھ پر بیعت کرے اور اس کی
حکومت کو تسلیم کرلے۔

وہ اپنے بھائی، بیٹے، بھتیجے اور بھانجوں کو نہایت اطمینان کے ساتھ
مسلح اور آراستہ کرکے ایک ایک کو ہزاروں کے ساتھ لڑنے کے لئے بھیج رہا ہے
ان کے بازو تلواروں سے کٹتے۔ ان کے کلیجے برچھیوں سے چھدتے اور ان کی چھاتیاں
تیروں سے چھنتے دیکھتا ہے۔ ایک ایک کی لاش کاندھے پر اٹھا کر لاتا ہے اور اپنے ہاتھ سے
زمین میں دفن کرتا ہے۔ خیمہ میں عورتوں کے کہرام سے ہر وقت ایک قیامت
بپا ہے، بی بی، بیٹی، اور بہنوں کی دلخراش صدائیں دل میں ناسور ڈال رہی ہیں
چھ مہینے کا شیر خوار بچہ ایک بے رحم کا تیر کھا کر گود میں مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا
ہے اس کے حلق سے خون کا فوارہ جاری ہے۔ سب چھوٹے بڑے کام آچکے ہیں۔
اور بچہ بھی کوئی دم کا مہمان ہے۔ اب سب کے بعد اپنی باری نظر آتی ہے اور یہ بھی
اہلبیت کے جہاز کا خدا کے سوا کوئی ناخدا نظر نہیں آتا۔ ان سب بلاؤں کا سامنا
ہے اور مصائب اور آفات کی یورش میں وہ کوہ راسخ کی طرح اپنے ارادہ پر ثابت
قدم ہے اور اپنے قول سے نہیں ہٹتا۔ وہ بے رحم قوم جو نانا کا کلمہ پڑھتی ہے اور
نواسے کے خون کی پیاسی ہے، جو چند نفوس کے مقابلے کے لئے ایک ٹڈی دل کو ساتھ
لے کر آئے ہیں اور اپنی تمام طاقت اس بات میں صرف کر رہے ہیں کہ جو ایذائیں
اور تکلیفیں آدم سے تا ایندم کسی ذی روح نے کسی ذی روح کو نہیں دیں۔ وہ سب
اپنے نبی کے دل پسندوں اور جگر کے ٹکڑوں پر ختم کی جاتی ہیں جو حرص و طمع کے نشے
میں دین و ایمان، رحم، انصاف، آدمیت، ہمدردی اور تمام خصائل انسانی سے
دست بردار ہو کر خدا کا گھر ڈھانے یعنی خاندان نبوت کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے پر تیار

اور کمر بستہ ہیں، نہ وہ ان کو بد دعا دیتا ہے، نہ ان کی شکایت کرتا ہے، نہ ان پر غصہ ہوتا ہے۔ بلکہ نہایت ٹھنڈے دل کے ساتھ اپنے حقوق جن کے ماننے کا وہ دعوی کرتے ہیں، ان کو مانتے ہے اور ان کے فرائض، جو خاندان نبوت کے ساتھ ان کو بجالانا چاہئیں انھیں یاد دلاتا ہے۔"

چھوٹے سے بڑے تک ہر شخص کے دل میں یہ امنگ ہے کہ سب سے پہلے میں اپنی جان خاندان پر نثار کروں، باپ کی یہ خواہش ہے کہ تلواروں کی آنچ میں بھائی بھتیجے اور بھانجوں سے پہلے اپنے جگر بند کو جھونک دوں۔ بھائی بھائی اور بھتیجوں سے پہلے مرنے کو تیار اور میدان جنگ کا خواستگار ہے۔ بھانجوں کی یہ تمنا ہے کہ ماموں اور ماموں کی اولاد پر سب سے پہلے ہم قربان ہوں بھتیجے کی یہ آرزو ہے کہ چچا کا فدیہ سب سے پہلے میں ہوں۔ بہن کو یہ ارمان ہے کہ اپنے بچوں کو بھائی اور بھتیجوں پر قربان کر دے بھائی اس فکر میں گھلا جاتا ہے کہ بھانجے اگر میری رفاقت میں مارے گئے تو بہن کو کیا منھ دکھاؤں گا، چچا، گو خود تین دن کی پیاس سے بے قرار ہے مگر اپنی پیاس کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ لیکن پیاسی بھتیجی کی بیقراری کسی طرح نہیں دیکھ سکتا۔ وہ مشکیزہ گلے میں ڈال اور جان ہتھیلی پر رکھ دشمنوں کی صفیں چیرتا ہوا دریا میں گھوڑا جا ڈالتا ہے۔ دریا کا سرد اور شیریں پانی لہریں مار رہا ہے اور پیاس کے مارے آنکھوں میں دم ہے دل قابو سے باہر ہوا جاتا ہے، دو چلوؤں میں پیاس بجھتی ہے مگر غیرت وحمیت اجازت نہیں دیتی کہ ننھے ننھے بچوں کی پیاس بجھنے سے پہلے اپنی پیاس بجھالے۔ وہ مشکیزہ بھر کر اسی طرح پیاسا دریا سے پھرتا ہے تاکہ جلدی جاکر بچوں کے خشک حلق میں پانی چوائے۔ لیکن دشمنوں نے گھیر کر دونوں بازو کاٹ ڈالے ہیں، اس پر بھی اس کو اپنے بازو کا کچھ خیال نہیں، اگر ہے تو مشکیزہ کی فکر ہے کہ مبادا پانی ضائع ہو جائے اور بچے پیاسے رہ جائیں۔ وہ سب حربے اپنے اوپر لیتا ہے مگر مشک پر آنچ نہیں آنے دیتا، جب تک کہ زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے نہیں گرتا۔"

بیبیاں خاوندوں کو اور مائیں بیٹوں کو زخمی اور قتل ہوتے دیکھتی ہیں۔ مگر کوئی زبان سے اف نہیں کرتی اور منھ سے سانس تک نہیں نکالتی، صرف اس خیال سے کہ جس مرتبے

اور سرپرست کی رفاقت ہیں وہ کام آئے اس کے دل میں میل نہ آئے اور وہ اپنے دل میں ہم سے محجوب نہ ہو۔ سب اس کی اور اس کی اولاد کی خبر سناتی ہیں پر پنے بچھڑے ہوئے کو کوئی یاد نہیں کرتی۔

دو صغیر سن بھائی ہیں جو صرف اس تصور پر کہ نبی کے نواسے کے رشتہ دار ہیں، حاکم کے حکم سے واجب القتل ٹھہرے ہیں جلاد دونوں کے سر پر تلوار لیے کھڑا ہے۔ بڑا بھائی منتیں کرتا ہے کہ "پہلے میرا سر اتار۔ اور چھوٹا بھائی کہتا ہے کہ "پہلے مجھ پر وار کر؟

ایک خدا کا بندہ، جو دشمنوں کی فوج کے ساتھ نبی کے نواسے سے لڑنے کو آیا ہے، باوجودیکہ دشمنوں کا ساتھ دینے میں اس کو ہر طرح دولت، جاہ و منصب کی توقع ہے اور ان کا ساتھ چھوڑنے میں جان اور مال اور خاندان کی تباہی کا یقین واثق ہے جس قوم میں وہ گھرا ہوا ہے، وہاں کوئی ترغیب یا تقریب ایسی نہیں کہ جو اس کا دل ظلم و بیدردی اور بے دینی اور حبِ جاہ و منصب سے ہٹا کر، ہمدردی، و دینداری کی طرف مائل کر سکے۔ اس کو ہر طرف سے یہی آواز آتی ہے کہ "جلد اس قلیل جمعیت پر فتح حاصل کیجیے۔ مردوں کے سر اتار لیجئے عورتوں اور بچوں کو اسیر کر کے چلیے" اور حاکم سے چل کر اپنی خدمات کا صلہ لیجیے۔ دوسری طرف کوئی ظاہری سامان ایسا نظر نہیں آتا جس کے لالچ میں وہ ان تمام فائدوں سے قطع نظر کر کے اپنی فوج کا ساتھ چھوڑ دے بلکہ برخلاف اس کے طرح طرح کی بلاؤں اور آفتوں کا سامنا نظر آتا ہے۔ باایں ہمہ وہ تمام دنیوی منفعتوں اور امیدوں پر خاک ڈال کر ان ظالموں سے کنارہ کرتا ہے۔ جن کی نصرت میں اپنی جان دینے کو "فوزاً عظیماً" جانتا تھا اور سب سے پہلے خاندان نبوت پر اپنی جان فدا کرتا ہے۔

چند وفادار رفیق اور دوست جو فرزند نبی کے ہمراہ ہیں اور جو ایک ٹڈی دل کے مقابلے میں اس قدر قلیل ہیں کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں وہ ایک عالم کو اپنے سردار سے منحرف اور برگشتہ پاتے ہیں۔ خود اس کے ساتھیوں کو اور رفیقوں کو اثنائے راہ میں اس کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کر اور آنکھیں چرا چرا کر جاتے دیکھ چکے ہیں، اپنے لئے اس کا ساتھ دینے میں کوئی نفع عاجل اور دنیا کی کوئی بھلائی نہیں سوجھتی، بلکہ ہر وقت موت کا سامنا ہے، اس کی رفاقت کی بدولت بھوک اور پیاس میں تین دن سے

جان لبوں پر آرہی ہے نہ کوئی رشتہ ہے نہ کوئی قرابت ہے جو اس کی رفاقت چھوڑنے سے مانع ہو۔ مگر وفاداری کا طوق ان کی گردن میں اور دوستی اور اخلاص کی زنجیر ان کے پاؤں میں پڑی ہے۔ کوئی خوف اور کوئی طمع ان کے اس تعلق کو قطع نہیں کر سکتی۔ ہر وقت یہ آرزو ہے کہ کب دشمن جنگ ملے اور کب خاندان نبوت پر اپنی جانیں قربان کریں اور کب اس فرض سے سبکدوش ہوں۔

اعتراف یہ چند باتیں مرثیوں کے عام بیانات سے جو کبھی کبھی کے سنے سنائے ہمارے ذہن میں محفوظ تھے محض سرسری طور پر استنباط کر لی گئی ہیں اگر زیادہ تفحص کیا جائے تو ایسی اور بہت سی باتیں اخذ کی جا سکتی ہیں ہمارے نزدیک نہ صرف اردو بلکہ فارسی و عربی شاعری میں بھی ایسی نظمیں مشکل سے ملیں گی جن میں ایسے اعلیٰ درجہ کے اخلاق بیان کیے گئے ہوں۔[1]

غرض اردو مرثیہ کو حالی سر خیل ناقدان اردو شاعری، بھی اعلیٰ ترین اخلاقی نظمیں مانتے ہیں اور محمد حسین آزاد، شبلی، امداد امام اثر وغیرہ جیسے مسلم الثبوت ادیبوں کی طرح ان کو مرثیوں کی ادبیت کے تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں۔ مگر ڈاکٹر فاروقی نہ تو انھیں جزو ادب سمجھتے ہیں اور نہ اس کا مستحق کہ ہم ان سے کسی طرح کا اخلاقی سبق حاصل کریں۔ ان کے جیسے مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کی نظر میں تو وہ "پست" بھی ہے اور صرف "عوامی ادب"، سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ؏

سخن شناس نہ ای دلبرا خطا اینجاست

(۲) حالی کے بیان کردہ منقول حصے میں ان تمام اعتراضات کے جوابات موجود ہیں جو نمبر ۹، ۱۰، ۱۱ میں کیے گئے ہیں۔ مرثیہ ایک رثائی نظم ہے اس لیے اگر اس میں بینیہ حصے زیادہ آجاتے ہیں تو اس میں کیا قباحت ہے ایسا ہونا ہی چاہیے حالانکہ جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے اگر آپ اساتذۂ فن کے طویل مرثیوں کا مطالعہ کریں گے تو بینیہ اجزا، رزم، بزم کے اشعار کے ایک چوتھائی سے زاید نہ ہوں گے۔

---

[1] شعر و شاعری مقدمہ۔

آئیے اب اس اعتراض پر بھی ایک نظر ڈال لیں جو نمبر ۲ میں پیش کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ مرثیے کے مختلف اجزا بالکل بناوٹی ہیں اور ان میں کوئی تاثراتی وحدانیت نہیں پائی جاتی ۔

اجزا اول تو یہ عرض کرنے دیجئے کہ ہر زبان کی نظم کے اجزاء اس کی بحریں ان کا ترنم، ان کے الفاظ کا آہنگ، سبھی کچھ بناوٹی ہوتا ہے۔ انسان کا مقرر کردہ کہیں آسمان سے اتر کر نہیں آتا۔ یعنی میر ضمیر وغیرہ نے جو اجزا مقرر کئے وہ کیا ہیں، ملاحظہ ہوں۔

(۱) چہرہ۔ یعنی مرثیہ کی ابتدا یہ مختلف طرح کی جاتی ہے، کبھی مناظر کی مرقع کشی ہے، کبھی صبح و شام کا سماں بیان کر کے کبھی براہ راست کسی تمہید کی خصوصیات کردار بیان کر کے، یہ گویا اس غم انگیز قصیدہ کی تشبیب ہے اور اس کے لئے آغاز کرنے کا کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں۔

(۲) رخصت۔ شہید ہونے والا جبری امام سے اجازت حاصل کرتا ہے، اگر اعزا میں سے ہے تو اسے خیمہ ہائے اہل حرم میں جانا، اور ان سے رخصت ہونا پڑتا ہے۔

(۳) میدان جنگ کے لئے روانگی۔ اس سلسلہ میں مجاہد کی مدح، گھوڑے اور تلوار کی تعریف۔

(۴) رجز اور مبارز طلبی:۔ عرب کا عام دستور تھا کہ جب کوئی سورما لڑنے جاتا تو میدان میں پہنچتے ہی دشمن کو مرعوب کرنے کے لئے اپنی بہادری اور جنگجوئی کی تعریف میں چند اشعار ضرور پڑھتا۔ اسی کو رجز کہتے ہیں۔ رجز پڑھنے کے بعد جنگجو پہلوان مبارز طلبی کرتا ...... یعنی دشمن کے تیغ زنوں کو للکارتا۔ کہ اگر کسی میں ہمت ہو تو وہ جری آکر اس سے تنہا مقابلہ کرے۔

(۵) جنگ کسی ایک فرد سے کبھی پورے لشکر سے۔

(۶) شہادت:۔ جب بھی کوئی مجاہد زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے زمین پر گرتا تو وہ امام حسین کو آخری سلام بہ آواز بلند کہہ کے اپنی شہادت سے

سے مطلع کرتا اور امام اس کے پاس اپنے کو جلد سے جلد پہنچاتے اور شہید کے انتقال
کے بعد اس کا لاشہ خیمۂ حرم اقدس میں لائے۔"

(۷) خیمہ میں لاش لانے کے بعد بی بیاں اس کے گرد جمع ہو جاتیں اور اس
شہید پر روتی اور بین کرتیں۔ اسی بینہ بیانی پر مرثیہ ختم ہو جاتا۔

ختم الفاظ میں تو مرثیہ کے یہ مختلف اجزا نہیں سے "بناوٹی" نہیں نظر
آتے۔ مرثیہ عموماً کسی ایک شہید کے بارے میں ہوتا ہے چہرہ میں اسی کا ذکر صراحۃً
یا کنایۃً کیا جاتا ہے۔ وہی رخصت ہوتا ہے، مدح اسی کی ذات کی، اسی کی تلوار
اور سواری کی جاتی ہے۔ رجز و جنگ و شہادت اسی کی بیان کی جاتی ہے اور آخر
میں بین اسی پر ہوتا ہے۔ اہل بصیرت کو تو ان اجزا میں صاف صاف وحدتِ
تاثر دکھائی دیتی ہے شب پرہ کے چشم کی بصارت کا ذکر ہی فضول ہے اسے تو دن میں
بھی آفتاب نظر نہیں آتا۔"

(۱۲۳) ارشاد ہے۔ کردار نگاری مختلف نفسیاتی جزئیات کو ملا کر ایک کل کی تخلیق
ہے مرثیوں میں بھی جزبات ہی پر زیادہ زور ہے لیکن جب ہم ان جزئیات کو ملا کر
ایک کل بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو ناکامیاب رہتے ہیں۔

۶) حق ہے کہ مرثیوں میں حسب ذیل کرداروں کی مکمل سیرت نگاری مختلف
جزئیات کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

حضرت امام حسینؑ، حضرت امام زین العابدینؑ، جناب قاسم ابن حسنؑ
جناب حبیب ابن مظاہر اور جناب حرؑ ریاحی مردوں میں اور حضرت زینبؑ، حضرت
فاطمہ صغرا اور جناب والدہ ام البنین والدۂ حضرت عباس خواتین میں۔ جناب مسلم
ابن عقیل اور ان کے دو صاحبزادوں کو جن صعوبتوں سے کوفہ میں گزرنا پڑا ان کے
بیان میں مرثیہ نگاروں نے ان کی سیرتوں کی بڑی اچھی مرقع کشی کی ہے۔ تعجب ہے
کہ شیکسپیئر کے ڈرامے پڑھانے والے بھی اردو مرثیوں میں مذکور کرداروں کو ایک
"کل" کی حیثیت سے تلاش کر لینے میں اپنے کو ناکامیاب پاتے ہیں ہیں تو تعجب ہوتا ہے

یہ ناکامی جستجو اور تلاش میں اخلاص کی کمی کے باعث ہے۔ نقد کے لئے جس خلوص کی شرط ہے اس کا ان کے یہاں فقدان ہے۔ انشا اللہ مثالیں میرے دعوے کو ثابت کر دیں گی۔

(۱۴) چودھواں اعتراض میں پہلے ہی تسلیم کر چکا ہوں۔ مگر انیس و دبیر اور ان کے ہمعصروں کے پیش رو نے کچھ اور شہدا پر بھی مرثیے لکھے ہیں۔ ان کے اقتباسات بھی آئندہ صفحات میں ملیں گے۔

شہدائے کربلا کے علاوہ چہاردہ معصومین کی شان میں بھی مرثیے لکھے گئے ہیں۔ پھر بھی میں اظہر علی فاروقی صاحب کا اس امر میں ہمنوا ہوں کہ بہت سے دوسرے شہدائے کربلا بھی خاص مرثیوں کے مستحق ہیں۔

(۱۵) پندرھواں اعتراض بہت عام ہے یعنی یہ کہ مرثیہ میں جو کردار پیش کئے گئے ہیں وہ عرب سے زیادہ ہندی بن گئے ہیں اور عورتوں کا شہیدوں کے لاشوں پر رونا اور بین کرنا عرب کردار کے خلاف ہے۔

معترضین یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ اردو مرثیہ ہے یعنی اردو میں کہا گیا ہے، اردو جاننے والے سامعین کے لئے لکھا گیا ہے اور اس امر کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے کہ اس کے سامعین گریہ و بکا کریں۔ اس لئے عرب سیرتوں میں تھوڑا بہت تغیر ضروری تھا۔ موقع و محل اسی کے متقاضی تھے۔

پھر یہ بھی غور کرنے والی بات ہے کہ دوسرے ملک کا کردار جب بھی کسی دوسرے ملک میں وہاں کے باشندوں کی زبان میں انھیں کو سمجھانے، سنانے دکھانے کے لئے پیش کیا جائے گا تو وہ ہوبہو اپنے اصلی ملک کا کردار نہیں رہ جائیگا۔ مثال کے طور پر شیکسپیر کے ڈراموں میں اطالوی یا حبشی کرداروں کو ملاحظہ کیجئے، اوتھلو خالص افریقی کردار نہیں رہ گیا ہے۔ اسی طرح اور غیر ملکی کردار۔ اردو مرثیوں میں جو کردار و واقعات کے پس منظر میں ظاہر ہوتے ہیں وہ بھی اس حد تک ہندی کہے جا سکتے ہیں کہ ان کے بیان میں عربوں سے زیادہ ایرانیوں کی بیان کردہ روایتوں سے کام لیا گیا ہے۔ ایرانی مزاج ہندوستانی مزاج سے زیادہ ملتا جلتا ہے

اور ان میں نرم دلی عربوں سے کہیں زیادہ ہے چونکہ ایرانی بھی امام حسینؑ اور شہدائے کربلا پر گریہ وبکا جزو ایمان سمجھتے ہیں، اس لئے انھوں نے انھیں روایتوں پر زور دیا، جو زیادہ مبکی ہیں۔

رہا خواتین کا شہدا پر بین کرنا۔ تو یہ عرب کا بھی ازمنۂ قدیم سے دستور چلا آتا تھا۔ اگر کسی کی لاش پر کوئی رونے والا نہ ہو تو یہ مردہ شخص کی توہین سمجھی جاتی تھی۔ حضرت یعقوب کی وفات پر حضرت یوسف نے پیشہ ور ماتم کرنے والوں سے پورے ایک ہفتہ رات دن ماتم کرایا تھا۔ حضرت حمزہ کی شہادت پر خود حضرت رسول مقبول ہی نے گریہ نہ فرمایا تھا بلکہ زنان بنی ہاشم کو ان پر بین کرنے کی ہدایت فرمائی تھی، بلکہ بعض روایتوں میں ہے کہ پیشہ ور ماتم کرنے والی اجنبی خواتین کو بلا کر نوحہ وشیون پر مامور فرمایا تھا۔ محضر شہادت پر دستخط کرنے والی روایت میں حضرت سیدۂ عالمیاں کا یہی تو دکھ دکھا گیا ہے کہ جب پنجتن پاک میں سے کوئی نہ ہو گا۔ اور خود امام کی بہنیں اور دیگر اہل حرم کو ظلم وتعدی کے ذریعہ ان پر رونے سے روک دیا جائے گا، تو پھر ان کے حسینؑ پر روئے گا کون؟ اور اسی کے جواب میں ان معصومہ کو ملت گریہ کن، کی بشارت دی گئی تھی۔

یہ ضرور ہے کہ جس تفصیل سے بین کے بند لکھے گئے ہیں وہ موجودہ عصر میں غیر ضروری محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن میر ضمیر وانیس ودبیر وتعشق کے عہد میں بین کے بند اگر اس سے کم لکھے جاتے ہیں تو اہل مجلس ان مرثیوں کو تشنہ اور نامکمل سمجھتے۔ اور ان سے وہ مقصد نہ حاصل ہوتا جس کے لئے وہ تصنیف کئے گئے تھے۔

کاش اردو مرثیوں پر اعتراض کرتے وقت وہ تمام عوامل پیش نظر ہو گئے ہوتے جن کے زیر اثر وہ لکھے گئے، یا جس ماحول اور عہد میں ان کی تصنیف وجود میں آئی۔ شیکسپیئر کے زمانے میں ہیرو اور ہیروئن کا پہلے ہی نظر میں عاشق ہو جانا یا دیکھتے ہی بیہوش ہو کر گر پڑنا ایک عام سی بات تھی، لیکن یہی بات آج کل کا کوئی ڈراما نویس لکھ دے تو وہ شخص سفیہہ اور بیوقوف سمجھا جائے گا انھیں امور کی طرف عدم توجہ نے اور مرثیوں کی کمی مطالعہ نے معترضین کو اپنی اعلیٰ ترین صنف شاعری پر اعتراض کرنے

اور قدرے دریدہ دہنی کے ساتھ اعتراض کرنے کی جرأت دلائی ہے۔

شہدائے کربلا اور چہار دہ معصومین پر جو مراثی کہے گئے ہیں۔ ان کی ہیئت اور تکنک ہو میر خلیق، میر ضمیر، میر فصیح نے ایجاد کی۔ اور وہ اس قدر مقبول اور محبوب ہوئی کہ ان کے عہد سے اس وقت تک جتنے مرثیے ان موضوعات سے متعلق کہے گئے ہیں ان میں بیشتر میں انھیں کی تقلید و تاسّی کی گئی ہے۔

یہ تکنک معترضین کو ناپسند سہی بالکل اسی طرح جس طرح عظمت اللہ اور کلیم الدین احمد کو فارسی اور عربی کی بحریں ناپسند ہیں، یا جس طرح ہم میں سے اکثر قدامت پسندوں کو آزاد نظموں یا جدید نثری نظموں کی تکنک ناخوشگوار و ناگوار معلوم ہوتی ہے لیکن ناقدین کو ہمیشہ تکنک سے زیادہ مواد، عصری تقاضے نظموں کے مقاصد، الفاظ کے دروبست، اظہار خیال کی ندرت تشبیہوں اور استعاروں کے حسن اور مجموعی طور پر کلام کے جمال و جلال تاثر سے بحث کرنا چاہیئے۔ اور اس پر نظر رکھنی چاہیئے کہ شاعر جو پیغام ہم تک پہونچانا چاہتا ہے ـــ اور ہر حقیقی شاعر ایک پیغامبر ہوتا ہے۔ وہ ہم تک یہ پیغام پہنچانے میں کہاں تک کامیاب یا ناکامیاب رہا۔ اور جس طرح کے جذبات وہ ہم میں برانگیختہ کرنا چاہتا ہے، جس نظریہ یا خیال کو وہ ہمارے دلوں میں اتارنا چاہتا ہے، جس تصویر کو ہمیں دکھانا چاہتا ہے اور مجموعی طور پر جو تاثر مرتسم کرنا چاہتا ہے آیا وہ اپنے اس مقصد کو حاصل کر سکا یا نہیں۔ اُردو مرثیہ سے بحث کرتے وقت یہ سارے اصول تنقید کیوں نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں اس ناانصافی کے وجوہ و اسباب کا سراغ سوائے تعصب کے اور کہیں نہیں ملتا۔ ورنہ دانے گوہ نور کو نون کہنا نہ تو عقل کی بات ہے، نہ صداقت کی، نہ درست گوئی کی اور نہ دیانت کی۔

اُردو مراثی کی وسعت، ان کے موضوعات کا تنوع، ان میں مضامین کی گوناگونی، ان کی اعلیٰ ترین اخلاقی تعلیمیں، ان میں بیان کردہ کرداروں کی سیرتیں اور ان کی بلندیاں اور پستیاں، ان میں مناظر فطرت کی گوناگوں رنگینیاں، ان کے ذریعے اُردو زبان میں ہزاروں تشبیہوں اور استعاروں کا اضافہ، اور ان کی حق گوئی

وراست گوئی، ایثار کرنے اور اصول کے لئے قربانی پیش کرنے کی تبلیغ، یہ ایسی چیزیں ہیں جو انھیں قابل فخر ادبی حیثیت دیتی ہیں۔ عالمی اور آفاقی ادب میں ہمارے مرثیوں کا صحیح مقام اور ان کی قدر و قیمت طے کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ناقدین کرام ذیل میں دیئے ہوئے مرثیہ گویوں کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ فرمائیں، پھر اس موضوع پر قلم اٹھانے کی جسارت کریں۔ صرف ان نامداروں کی تخلیقات ہی کے مطالعہ کے لئے ایک عمر درکار ہوگی۔

مرثیہ گوشعرا

۱۔ میر ضمیر ۲۔ میر خلیق ۳۔ دلگیر ۴۔ میر انیس ۵۔ میر مونس ۶۔ میر انس ۷۔ میر سلیس ۸۔ میر نفیس، میر وحید ۹۔ میر عارف ۱۰۔ میر فائق ۱۱۔ قدیم، ۱۲۔ عروج ۱۳۔ منے صاحب زکی ۱۴۔ پیارے صاحب رشید ۱۵۔ باقر مرزا حمید، ۱۶۔ مرزا دبیر ۱۷۔ مرزا اوج ۱۸۔ مرزا طاہر ۱۹۔ ثابت ۲۰۔ فراست ۲۱۔ خبیر ۲۲۔ میر عشق ۲۳۔ میر تعشق ۲۴۔ مودب ۲۵۔ مہذب ۲۶۔ چھنگا صاحب حسین ۲۷۔ ذوالقدر بہادر محسن ۲۸۔ علی حامد جونپوری ۲۹۔ مہاراجہ محمود آباد محب ۳۰۔ آرزو لکھنوی ۳۱۔ مظفر علی خاں نواب جانشہ ۳۲۔ شدید لکھنوی ۳۳۔ جعفر علی خاں اثر ۳۴۔ شاد عظیم آبادی ۳۵۔ نواب افسر ۳۶۔ نجم آفندی، ۳۷۔ جمیل مظہری ۳۸۔ شمیم کرہانی ۳۹۔ وفا ملک پوری۔ ۴۰۔ ظفر لکھنوی ۴۱۔ نانک لکھنوی ۴۲۔ آل رضا رضا۔ ۴۳۔ نسیم امروہوی۔ ۴۴۔ جوش ملیح آبادی۔ ۴۵۔ بادشاہ مرزا انجم۔ ۴۶۔ حکیم آشفتہ، ۴۷۔ مہاراجہ محمود آباد۔ ۴۸۔ ڈاکٹر صفدر حسین۔ ۴۹۔ مہدی حسین عزم ۵۰۔ وصی فیض آباد ۵۱۔ قمر جلالوی۔ ۵۲۔ کرار نوری۔ ۵۳۔ شوکت تھانوی۔ ۵۴۔ ڈاکٹر یاور عباس، ۵۵۔ منظر علیمی ۵۶۔ ضیا اکبرآبادی ۵۷۔ زاہد ردولوی۔ ۵۸۔ ندیم اعظم گڑھی، ۵۹۔ ڈاکٹر منظور مہدی۔ ۶۰۔ محمد یوسف رواں۔ ۶۱۔ قاسم علی خاں راجہ پنڈراول، ۶۲۔ شہید لکھنوی۔ ۶۳۔ سید غلام امام۔ ۶۴۔ محسن نبیرہ ذوالقدر بہادر جونپوری۔ ۶۵۔

فیضیؔ شاگرد نسیم امروہوی۔

یہ تو مرثیہ گویوں میں سے ان چند نامداروں کے نام ہیں جنھوں نے واقعاتِ کربلا یا سوانح چہاردہ معصومین یا فلسفۂ شہادت و کردار و سیرت شہدائے کربلا سے متعلق مراثی لکھے ہیں۔ ایسے مراثی کی تعداد بلا مبالغہ مطبوعہ و غیر مطبوعہ صورتوں میں پانچ ہزار سے زائد ہے لیکن اردو میں ایسے مرثیوں کی بھی کمی نہیں جو مختلف زعمائے قوم، قائدین ملت اور عظیم شعراء، ادباء اور فنکاروں کی موت پر کہے گئے ہیں اور ایسے بھی کثیر تعداد میں ملیں گے جو مخصوص دوستوں، رفیقوں، عزیزوں اور محبوبوں کے ارتحال پر نظم کیے گئے ہیں۔ مہاتما گاندھی کے خون ناحق پر تو اردو کے نو دس شاعروں نے ایک سے ایک بہتر مرثیے کہے ہیں۔ جن میں سے وامق جونپوری اور تسنیم کرہانی کے مرثیوں نے خاص شہرت پائی۔ عجیب بات یہ ہے کہ مہاتما سے متعلق مرثیوں میں سے کئی غزلوں کی صورت میں ہیں۔ بعض کی بحریں بھی فارسی و عربی کی تاسی سے آزاد ہیں اور ان پر مشرق کی جگہ مغرب کے اوزان کی چھاپ لگی ہے، اسی طرح محمد علی جناح، ابوالکلام آزاد، سروجنی نائیڈو، جواہر لعل نہرو اور ٹیگور کے انتقال پر بھی مرثیے کہے گئے ہیں۔ ان میں سے بھی اکثر ادب پارے ہیں۔

رہے شہدائے کربلا پر پرانے ڈھنگ کے مرثیے تو جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ انھوں نے ماتموں اور نوحوں کی صورت اختیار کر لی ہے سلام بھی اس ضمن میں آجاتے ہیں۔ سلاموں میں اب سے ایک صدی پہلے تک سلامی یا مجرئی کی لفظ کسی نہ کسی مصرعے میں اس شناخت کے لیے لانا ضروری سمجھتے تھے کہ یہ سلام ہے۔ مگر میر انیسؔ کے عہد ہی سے یہ طریقہ متروک ہو گیا تھا۔ سلام اور نوحے میں غزل ہی کی طرح مطلع، حسن مطلع اور مقطع ہوتا ہے۔ اور بحر و قافیہ و ردیف کا التزام بھی۔ سلام مرثیوں کی طرح تحت اللفظ پڑھے جاتے ہیں۔ اور نوحے اور ماتم بڑے لحن سے گریہ آور دھنوں میں۔ تال و سُر کا لحاظ کرکے ان کو پڑھتے وقت سینہ زنی بھی کی جاتی ہے۔ نوحوں اور ماتموں کا حساب کرنا اور ان کی تعداد کا اندازہ کرنا تقریباً محال ہے۔ وہ بے حساب ہیں۔

تیسرا باب

جوابات کے ثبوت میں مختلف مرثیوں سے

مثالیں

تیسرا باب
مثالیں

معرضِ بحث میں جو اردو مرثیہ ہے اس کی وسعتوں کا اندازہ لگانے کے لئے مختلف مرثیوں سے چند مثالیں پیش ہیں۔ یہ مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ ناظرین انھیں تھوڑی سی مثالوں سے یہ دیکھ لیں گے کہ مرثیہ کی تنقیص کرنے والے ناقدوں نے کسقدر کوتاہ نظری اور بے بصیرتی سے کام لیا ہے۔ انھیں مثالوں سے ان کی کمی مطالعہ بھی آشکار ہو جائے گی۔ صرف چند مشہور مراثی کو پڑھ لینے کے بعد پوری صنفِ مرثیہ گوئی پر رائے زنی کرنا نہ صحیح نقد ہے اور نہ ادبی دیانت داری۔

لیکن میری طرف سے کہاں تک جواب! خود مثالیں اس فریضہ کو بہ احسن وجوہ ادا کر دیں گی۔ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید۔

میر انیس

قبل اس کے کہ میں دوسری مثالیں پیش کروں، میر انیس سے مرثیہ کی خصوصیات سنیے۔ انھوں نے اپنے مرثیے "نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری" میں جو چند تمہیدی بند کہے ہیں ان میں اپنے آباء واجداد کی مرثیہ گوئی پر فخر کیا ہے۔ اس کے بعد اپنے کلام کے محاسن بیان کرنے کے ضمن میں یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اردو مرثیہ کو کیا ہونا چاہیے اور اس میں کیا کیا خوبیاں پائی جانی چاہئیں۔ خداوند عالم سے ان خوبیوں کی اپنے کلام کے لئے دعا مانگ کر میر انیس نے تمہید کو خالص شاعرانہ تعلّی کے الزام سے صاف بچا لیا ہے اور حق یہ ہے کہ ربِ کلیم نے ان کی یہ دعا سُن لی۔ انیس کا کلام ان محاسن سے سراپا معمور ہے جس کے لئے فرماتے ہیں۔!

مبتدی ہوں مجھے توقیر عطا کر یارب! شوقِ مداحیِ شبیر عطا کر یارب!
سنگ ہو موم وہ تقریر عطا کر یارب! نظم میں رونے کی تاثیر عطا کر یارب!
جدّ و آبا کے سوا اور کی تقلید نہ ہو
لفظ مغلق نہ ہوں گنجلک نہ ہو تعقید نہ ہو

وہ مرقع ہو کہ دیکھیں اسے گر اہلِ شعور ہر ورق میں کہیں سایہ نظر آئے کہیں نور
غل ہو یہ ہے کششِ موقلمِ طُرّہ طور صاف ہر رنگ سے ہو قدرتِ صانع کا ظہور
کوئی ناظر بھی جو یہ نابِ نظیریں سمجھے
نقشِ ارژنگ کو کاواکِ لکیریں سمجھے

قلمِ فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ شمع تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ
صاف حیرت زدہ مانی ہو تو بہزاد ہو دنگ خون برستا نظر آئے جو دکھاؤں صفِ جنگ
بزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

روزمرّہ شرفا کا ہو سلاست ہو وہی لب و لہجہ وہی سارا ہو متانت ہو وہی
سامعیں جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی
لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لیے سرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لیے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لئے زیب ہے خالِ سیہ چہرۂ گلرو کے لیے
داند آں کس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

بزم کا رنگ جدا، رزم کا میداں ہے جدا یہ چمن اور ہے زخموں کا گلستاں ہے جدا
فہم کامل ہو تو ہر نامے کا عنواں ہے جدا مختصر پڑھ کے رلا دینے کا ساماں ہے جدا
دبدبہ بھی ہو مصائب بھی ہوں توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

میر انیس کے ان بندوں سے صاف ظاہر ہے کہ اردو مرثیہ میں پانچ چیزیں ضروری ہیں:۔

(۱) مدح (۲) بزم (۳) رزم (۴) بین (۵) اور ان سب پر حاوی فصاحت و بلاغت، شرفا کا روزمرہ ہو، لب و لہجہ بازاری نہ ہو، ہر لفظ موقع و محل کے لحاظ سے استعمال کیا جائے۔ مضامین عالی ہوں۔ اور چونکہ یہ مرثیہ ہے اس لئے "درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے" ان ساری لفظی و معنوی خوبیوں کو سمیٹ کر آخری بیت میں یوں بیان کیا ہے

دبدبہ بھی ہو، مصائب بھی ہوں توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں، رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

خدائے مرثیہ گویاں کی اس تعریف مرثیہ کے بعد اردو مرثیہ پر حالی کا اعتراض باقی نہیں رہتا۔ اردو مرثیہ کے اصول اور اس کی حدیں انیس کے فرمودہ کے مطابق ہی رکھنا پڑیں گی۔

کچھ معترضین کے ذہن میں حسینؑ اور یزید میں اس جنگ کے اسباب واضح اور صاف نہیں بعض اس مغالطہ میں گرفتار ہیں کہ یہ بنی ہاشم اور بنی امیہ کے خاندانی تنازعہ کا نتیجہ تھی۔ بعض اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ جنگ ملک گیری کے سلسلہ میں تھی۔ ہمارے مرثیہ گویوں نے اس پر کافی روشنی ڈالی ہے۔

امام حسینؑ کا مقصد جنگ کرنا نہ تھا۔ بلکہ قربانی پیش کرنا، اگر وہ جنگ کرنا چاہتے تو مدینہ نہ چھوڑتے۔ اس شہر کی اکثریت ان کا ساتھ دیتی اور ان کی آواز پر اطراف و جوانب سے حامیان آل ہزاروں کی تعداد میں اکٹھا ہو جاتے مگر وہاں تو منشا ہی کچھ اور تھا۔ مدینہ سے چلتے وقت جو جم غفیر ساتھ تھا وہ مکہ میں کم کیا گیا۔ پھر مکہ سے کوفہ تک کی راہ میں سینکڑوں ساتھیوں کو امام نے اپنے اپنے گھر چلے جانے پر اصرار کر کے رخصت کر دیا۔ دوم محرم سے شب دہم تک اسی طرح تعداد کم سے کم رکھنے کی کوشش امام کی طرف سے جاری رہی۔ جنگ کرنے والا فوج اکٹھا کرتا ہے نہ کہ امام کی طرح ساتھیوں کی تعداد کم کرتا جاتا ہے۔ غرض مقصد

قربانی پیش کرنا تھا نہ کہ جنگ کرنا۔

قربانی پیش کرنیکے وجوہ

الف:۔ امام حسینؑ نے یہ قربانی کیوں پیش کی اسے پہلے مرزا دبیر سے سنیئے، پھر اس کے مدلل وجوہ سید نواب افسر کے مرثیہ میں ملاحظہ فرمایئے۔

مرزا دبیر مرزا دبیر نے اپنے مرثیہ "جب ہوئی ظہر تلک قتل سپاہ شبیر" میں امام حسینؑ کی ایک مناجات لکھی ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے کربلا میں جام شہادت بہ خوشی اس لیے نوش فرمایا کہ یہی مرضئ الہیٰ تھی۔ اور اسی طرح وہ ہمیں راہ عمل دکھا سکتے تھے جس پر چل کر اسلامی نقطۂ نظر سے ہم انسان کامل بن سکتے ہیں۔ جب مرثیہ گو امت کے بخشوانے کا فقرہ استعمال کرتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ جس طرح عیسائیوں کے عقیدہ میں عیسیٰ ابن مریم محض اس لئے مصلوب ہوئے کہ جو بھی ان پر اعتقاد رکھے اور ایمان لائے وہ یقینی جنت کا مستحق بن جائے گا۔ اسی طرح امت محمدی بھی یہ سمجھ لے کہ امام حسینؑ نواسۂ رسول نے اتنی بڑی قربانی اس لئے پیش کی کہ ان کو اپنا ہادی و امام ماننے والے، ان سے زبانی محبت کا دم بھرنے والے، باوجود گنہگار ہونے کے اور حقوق اللہ اور حقوق عباد سے اغماض برتنے کے محض "حسین حسینؑ!" کہتے یا فریادی ماتم کرنے سے فردوس بریں کے حقدار بن جائیں گے۔ بلکہ امت کے بخشوانے کے یہ معنی ہیں کہ امام حسینؑ اپنے عمل سے حق پرستی، ایمان و راستی راضی برضا الہیٰ رہنے کا وہ راستہ دکھا گئے ہیں کہ اگر کوئی اس پر استقلال کے ساتھ بخلوص نیت چلے گا، تو وہ یقینی بہشت بریں میں قیام کا مستحق بن جائے گا۔ ایسے ہی لوگ مومن کے لقب کے مستحق ہوں گے۔ ان کے دلوں میں سوائے خوف خدا کے کسی کا ڈر نہ ہوگا۔ وہ انبیا و انسانیت کے پتلے ہوں گے۔ وہ متقی و زاہد و ابرار ہوں گے۔ ان سے تکبر و غرور، جاہ و حشم، خود بینی و خود نمائی، بے انصافی وظلم و تعدی سے دور کا بھی واسطہ نہ ہوگا۔ ان کے سینے دولت و زر کے حرص سے

خالی ہوں گے۔ وہ قول کے سچّے اور عمل کے پکّے ہوں گے، اور ہر مصیبت و آفت بلا کا پامردی سے مردانہ وار مقابلہ کریں گے اور ظلم و تعدی، نا انصافی اور غیر انسانی افعال کے مرتکب افراد کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کریں گے۔ وہ اپنے ضمیر کی آواز کو نہ دبنے دیں گے اور حق و صداقت کے لئے ہر طرح کی قربانی پیش کرنے کے لئے تیار رہیں گے۔

(۱) الف:۔ اب مرزا دبیر کے الفاظ میں امام حسینؑ کی بارگاہ الٰہی میں مناجات ملاحظہ ہو۔ وقت وہ ہے کہ سارے اصحاب و اعزا شہید ہو چکے ہیں۔ جوان بیٹا، شبیہ پیغمبرؐ علی اکبر تک راہ حق میں سینہ پر برچھی کھا کر بوڑھے باپ کے سامنے تڑپ تڑپ کر جان دے چکا ہے اور اب سوائے امام کے اور شش ماہہ علی اصغر کے کوئی شہید ہونے والا باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اس وقت حسینؑ خاک پر سر رکھے اپنے خالق سے دعا فرما رہے ہیں:

روزِ عاشور لٹا جب کہ گلستانِ حسینؑ — غم سے بھائی کے ہوا چاک گریبانِ حسینؑ
قتلِ اکبر سے ملا خاک میں ارمانِ حسینؑ — جز اجل کوئی نہ تھا ان میں نگہبانِ حسینؑ

حق سے کہتے تھے نہیں رنج تباہی مجھ کو
صبر دے پیاروں کی فرقت میں الٰہی مجھ کو

اب نہ قاسم مرا جیتا ہے نہ اکبر باقی — اب علمدار سلامت ہے نہ لشکر باقی
بھانجے ہیں، نہ بھتیجے، نہ برادر باقی — اب فقط سر مرا باقی ہے اور اصغر باقی

قتلِ اصغر ہو مرا سر بھی جدا ہو جائے!
اس امانت سے بھی شبیر ادا ہو جائے!

یا خدا تجھ پہ میں صدقے، مرا لشکر بھی نثار — دل فدا، روح فدا، جان فدا، سر بھی نثار
علی اکبر بھی فدا اور علی اصغر بھی نثار — تجھ پہ باقر بھی فدا، عابدِ مضطر بھی نثار

میں نے جو کچھ ترے دربار سے پایا مولا
سب تری راہ میں خوش ہو کے لٹایا مولا

وہ کلیجے پہ دھرے ہاتھ پڑے ہیں اکبرؑ ہے وہ عباسؑ دلاور، وہ حسنؑ کا دلبر
ایک اک پیارے کو قربان کیا گن گن کر کی امانت میں خیانت نہ ذرا اے داور
تو نے دولت جو مجھ خاک نشیں کو سونپی
وہ امانت ترے بندے نے زمیں کو سونپی

قتل عباسؑ ہوئے میں نے کیا شکر ترا یہ کمر ہو گئی خم، اس میں گنہ میرا کیا
نکلا اکبرؑ کا بھی دم، آنسو نہ میرا نکلا کی بدی نانا کی امت نے نہ بد میں نے کہا
یہ بھی بندے ہیں ترے، میں بھی ترا بندہ ہوں
دشت غربت میں پریشاں ہوں پراگندہ ہوں

تو نے بچپن میں کھلائے ثمر خلد بریں اب اگر تیسرا فاقہ ہے، نہیں کچھ میں حزیں
تو سی بچپن میں زبان نبی عرش نشیں آج اگر بیٹے کو پانی نہیں، تو خیر نہیں
اک دن حلق تھا اور فاطمہ کے شیر کی دھار
آج راضی ہوں گلے پر چلے شمشیر کی دھار

تو شہنشاہ شہنشاہوں کا ہے، بار خدا ہیں برابر تری درگاہ میں شاہ و گدا
خاطر عاشق جانباز ہے۔ البتہ جدا لے خوشا حال کہ مجھ سے ہو ترا عشق ادا
حلق پہ تیغ رہے، سینے پر جلاد رہے
لب پہ ہو نام ترا، دل میں تری یاد رہے

دُر دنداں مرے نانا نے تجھے نذر دیا لے گئیں قبر میں داغ غم محسن زہراؑ
سرخ رو ہے ترے دربار میں بابا میرا دل کے ٹکڑے مرے بھائی نے کیے تجھ پہ فدا
آج شبیرؑ بھی ان سب کے مقابل ہو جائے
سر مرا گر تری سرکار کے قابل ہو جائے

سر مرا کٹ کے یقیں ہے سوئے کوفہ جائے پھر یہ محتاج بھلا نذر تری کیا لائے
تیر اصغرؑ کو مگر ہاتھوں پہ اب کھلوائے درجہ صبر جو باقی ہے وہ اب ہاتھ آئے
پیش کش لاشۂ اصغرؑ ہی بھلا لائے حسینؑ
ہاتھ خالی ترے دربار میں کیا آئے حسینؑ

سب مرے نورِ نظر قتل ہوئے زیرِ نگاہ — بس مٹے یا شکر کیا، یا کہا "اِنّا لِلّٰہ"
جب کہ ہو مرضیِ معبود سے بندہ آگاہ — پھر ستم پر جو ستم ہوں نہ کرے منھ سے آہ
آگے کہتا تھا نہ عریاں سرِ خواہر دیکھوں
پر جو تو خوش ہو تو زینب کو کھلے سر دیکھوں

قتلِ اکبر تو مرا ہو چکا اے ربِ غفور — اب اگر تجھ کو نہ ہو نسلِ امامت منظور
ذبح عابد کو کروں اب میں بانوئے حضور — ہیں خلیل اور وہ ذبیح آج سے ہو جائے مشہور
ہاتھ رک جائے گلے پر تو قلم ہات کروں
ہات سے ذبح کروں، لب سے مناجات کروں

بندہ پرورا میں ہوں اک عبدِ غریب و احقر — بیکس و بے وطن و بے پدر و بے مادر
منزلِ ملکِ عدم ہیں تو مرا ہو رہبر — نہ تو میں راہ سے آگاہ نہ منزل کی خبر
شوق بھی ہے رغبت بھی مجھ کو تری درگاہ کا ہے
سامنا بندۂ ناچیز کو اللہ کا ہے

وحشتِ قبر نکیرین کا ڈر، یا اللہ — گھر نیا لوگ نئے اور میں ناواقف، آہ!
سہل ہو، راہ صراط، اور ہو اُمت ہمراہ — دیتا خورشیدِ قیامت سے قیامت میں پناہ
آگ سے خیمہ جلیں، دھوپ سے دلدار جلیں
پر دمِ حشر نہ دوزخ میں گنہگار جلیں؟

سیّد نواب افسر

(ب) اب سیّد نواب سے کچھ خاص طرح کے اعتراضات کے جوابات ملاحظہ ہوں - ان سے وجہ شہادت اور اہمیتِ واقعہ کربلا پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

(۱) کچھ لوگ کہتے ہیں کہ فرزندِ رسول خود ہلاکت میں پڑے۔ اگر بیعت کر لیتے تو یہ المیہ نہ ہوتا۔ افسر سے اس کا مدلل جواب سنئے۔

حیرت انگیز ہے دنیا کا یہ اندیشۂ خام — داعیِ حق کبھی ہوتا نہیں، باطل کا غلام
کیا یہ جائز تھا کہ وہ ہو کے زمانہ کے امام — مانتے فاسق و فاجر کو امیرِ اسلام
رہنما ہو کے منافق کی اطاعت کرتے
کیا حسین اپنے فرائض سے بغاوت کرتے

جان سے بڑھ کے ہو مقصد جو عزیز اور اہم جس سے وابستہ ہو اصلاح و مفاد عالم
اور ہو جائیں کچھ اس طرح کے حالات بہم کام بنتا نہ ہو بے منتِ خنجر، پیہم
جان دینے کے علاوہ کوئی صورت ہی نہ ہو
بھاگے خطروں سے تو مقصد کی حفاظت ہی نہ ہو

ایسے عالم میں شریعت کا تقاضا کیا ہے؟ عقل کیا کہتی ہے؟ حکمت کا تقاضا کیا ہے؟
نوعِ انساں کی محبت کا تقاضا کیا ہے؟ ذمہ داریِ ہدایت کا تقاضا کیا ہے؟
حق کو پردہ ہی میں رہنے دے کہ آگاہ کرے
رہنما جان دے، یا خلق کو گمراہ کرے

تھے اسی منزلِ ترجیح و توازن میں امام جان دینے پہ تھی موقوف حیاتِ اسلام
تھا شکنجہ کی طرح سخت حکومت کا نظام حرفِ آخر تھا فقط بیعتِ فاسق کا پیام
تو بہ بیعت کے لئے ہاتھ بڑھاتے شبیر!
دین مٹ جاتا اگر جان بچاتے شبیر

مقصدِ زیست نہ پورا ہو تو کس کام کی زیست آپ ہی اپنا جو حاصل ہو وہ بے نام کی زیست
طلبِ مرضیٔ معبود ہے اسلام کی زیست نشرِ پیغام میں ہے صاحبِ پیغام کی زیست
زندہ ہیں راہِ شہادت سے گزرنے والے
فتح پاتے ہیں یہاں موت پہ مرنے والے

(۲) حسین جنگ نہ کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے جنگ سے بچنے کی کوشش کی۔

جتنا ممکن تھا حفاظت کا بھی ساماں کیا نکلا گھر چھوڑ کے خطرہ جو وطن میں دیکھا
عہد منظور کیا گوشہ نشیں رہنے کا چھوڑ کر ملک چلے جائیں کہیں، یہ بھی کہا
ہر ستم سہنے پہ راضی تھے اطاعت کے سوا
صلح ہر شرط پہ منظور تھی بیعت کے سوا

تھی مگر وقت کے بندوں کو ضرورت ان کی نظر انداز نہ ہو سکتی تھی بیعت ان کی
خود سمجھتا تھا زمانہ اہمیت ان کی ختم کرنا تھی جداگانہ حقیقت ان کی
کامیابی میں بھی اک صورتِ ناکامی تھی
ان کی تصدیق نہیں تھی تو بڑی خامی تھی

(۳) امام حسینؑ نے جنگ کے لئے لشکر کیوں نہ اکٹھا کیا۔ اور مقابلہ کے لئے مادی وسائل کیوں فراہم کئے؟

کتنے ایسے تھے جو پہچانتے تھے حق امام؟ کتنے ایسے تھے جو سن سکتے تھے رہبر کا پیام
مدتیں گزری تھیں وابستۂ باطل تھے عوام بے خبر آلِ نبی سے تھی نئی نسل تمام
کتنے تھے کھیلتے جو نیزہ و شمشیر کے ساتھ
کتنے ایسے تھے جو آ سکتے تھے شبیر کے ساتھ

سخت گیری کا وہ عالم، وہ حکومت کا دباؤ وہ جہالت کا تموج، وہ سیاست کے گھماؤ
پیچ در پیچ وہ گرداب وہ دریا کا بہاؤ مکر و تزویر کی موجوں میں وہ جمہور کی ناؤ
کتنے گھر پھونک کے باطل کا شرارا رکتا
کتنے سینوں پہ یہ طوفان کا دھارا رکتا

اس تباہی سے نہ ہوتا کوئی مقصد حاصل سخت دشوار تھی اس طرح شکستِ باطل
اور ہو جاتی حقیقت کی صفائی مشکل دور ہو جاتی بہت روشنیٔ مستقبل
ظلم پر جوش فرو کرنے کا پردا رہتا
مدتوں فکر کی دنیا میں اندھیرا رہتا

دوسرے رُخ سے بھی تصویر کو دیکھیں ہم اگر یعنی اس وقت کے حالات تھے کچھ نوع دگر
بار تھی بیعتِ فاسق جو مسلمانوں پر یہ بھی ممکن تھا کہ ہوتی نہ والا کی ظفر
حاکمِ وقت سے راضی دلِ جمہور نہ تھا
عام ہو جاتی بغاوت تو کوئی دور نہ تھا

عسکری فتح مگر شہ کی یہ وقتی ہوتی کیا ضمانت تھی کہ بدلیں گے نہ حالات کبھی
آج تو جنگ، شہ دیں کو وہ سر کرنا تھی کہ ہو نا قابلِ انکار صداقت جس کی
ہر زمانہ میں درِ فکر و نظر باز رہے
حشر تک جس کا نتیجہ اثر انداز رہے

آخری جنگ تھی حالات تھے سب پیشِ نظر جانتے تھے کہ مہم یوں نہیں ہونے کی یہ سر
عام افراد کے ذہنوں پہ ہے طاقت کا اثر جرأت پیرویٔ حق انھیں دینا ہے اگر
حق و باطل کی روش ان پہ عیاں کر دی جائے
ان کے احساس میں بجلی کی تڑپ بھر دی جائے

شدتِ ظلم کو یوں فرصت ارزانی ہو! کہ سرِ عام نبی زادوں کی قربانی ہو
دیکھنے والا تڑپ جائے جسے جگر پانی ہو ذہن یکسو ہوں تو جذبات میں طغیانی ہو

عام انساں کی نظر رازِ حقیقت پا جائے
زندگی موت سے لڑ جانے کی طاقت پا جائے

(۴) رخصت کے موقع پر بی بیوں کے کمزور اور شکستہ دلوں کو احساس فرض کی طاقت کیونکر بہم پہنچائی، ملاحظہ ہو :-

آخر کار کیا دردِ جگر کا اظہار یعنی آئے ہیں بنا کر علی اصغر کا مزار
اب کوئی مونس دیا ور نہ عزیز و غمخوار آخری تھا یہ مجاہد جو ہوا حق پہ نثار

فرض ملتا ہے اگر ہجر گوارا بھی نہیں
کیا کریں اب کسی بچے کا سہارا بھی نہیں

مرنے جاتے ہیں کہ چارہ نہیں مرنے کے سوا وہ جو سب مل کے سہارا تو ہو یہ فرض ادا
مرحلہ سخت سہی پھر بھی ہے یہ فخر کی جا کہ ہمیں حوصلۂ خدمتِ اسلام ملا

اب تو اس راہ میں جو کچھ ہو گوارا ہے ہمیں
دین پر وقت پڑا ہے تو پکارا ہے ہمیں

کیا یہ ممکن ہے کہ آواز یہ آواز نہ دیں پرِ شکستہ یونہی دیکھیں پر پرواز نہ دیں
زندگی حق کو نہ بخشیں، دمِ اعجاز نہ دیں اپنا سر دے کے نئی زیست کا انداز نہ دیں

ہو کے عیسیٰ نہ علاجِ دلِ بیمار کریں
کیا صداقت کی مدد کرنے سے انکار کریں

فیصلہ تم کو بھی کرنا ہے کہ تم بھی ہو شریک دین کو بیچ کے ہم مانگ لیں کیا جاں کی بھیک
زندگی اس کی رضا میں ہے ہمارے نزدیک موت بھی ٹھیک ہے، بربادیِ ناموس بھی ٹھیک

تم اگر فرض میں شامل ہو تو غم بیکار ہیں
تم کہو حق تمہیں پیارا ہے کہ ہم پیارے ہیں

میر انیس

۲۔ امام حسین نے جنگ نہیں کی، بلکہ بقائے اسلام کے لئے قربانی پیش کی۔ نہال ملت و مذہب خشک ہو رہا تھا، نبی زادے نے اپنے اصحاب خاص، اعزا، محبوب، بھائیوں اور جگر بندوں کے ساتھ ساتھ خود اپنے خون سے اس کی آبیاری کی کہ وہ تا قیام قیامت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سرسبز و شاداب ہو گیا۔ انسانیت کو ابدی سرخروئی حاصل ہو گئی اور یزیدیت یا شیطنت کو سیاہ روئی۔

میر انیس نے اپنے مراثی میں امام کی صلح پسندانہ کوششوں کا بار بار ذکر کیا ہے مثلاً "بہ خدا فارس میدان تہور تھا حُر" سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ موقع وہ ہے جب دسویں محرم کی صبح کو لشکرِ عمر سعد میں صف آرائی ہو چکی ہے۔ اور فوج یزیدی کی طرف سے امام کے مٹھی بھر ساتھیوں پر تیر باراں کر کے حملہ کے لئے رسالے بڑھ رہے ہیں ادھر بھی منچلے سورما تیغیں سونت کر مقابلہ کے لئے بڑھ جانے کے لئے امام کے حکم کے بے چینی سے منتظر ہیں۔ مگر حضرت انھیں روک دیتے ہیں۔ وہ کیوں؟ اس لئے کہ ان نام نہاد مسلمانوں کو آخری بار صلح و آشتی کی تعلیم دینا چاہتے ہیں اور اس گناہ عظیم کے ارتکاب سے روکنا چاہئے ہیں جس کے بعد وہ ہر رحمت ایزدی سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائیں گے۔ یہ صحیح رہنمائی کا یہ فرض آخری دم تک امام ادا کرتے رہے ملاحظہ ہوں انیس کے مرثیے کے چند بند:-

برچھیاں تول کے ہر غول سے خونخوار بڑھے ۔۔۔ نیزے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے اسوار بڑھے
تیر جوڑے ہوئے چلوں میں کماندار بڑھے ۔۔۔ بولے شہ ہاں ابھی کوئی نہ نہار بڑھے

اسد حق کے گھرانے کا یہ دستور نہیں
میں نبی زادہ ہوں سبقت مجھے منظور نہیں

یہ سخن کہہ کے مخاطب ہوئے اعدا سے امام ۔۔۔ اے سیاہ بختو رزم ولے فتنہ و شام!
تم یہ کرتا ہے حسین آخری حجت کو تمام ۔۔۔ پسر مصحف ناطق ہوں سنو! میرا کلام!

سخن حق کی طرف کانوں کو مصروف کرو
شور باجوں کا مناسب ہو تو موقوف کرو

کم ہوا غلغلۂ فوج ستم سب یک بار　　یوں گہر بار ہوئے شہ کے لب گوہر بار
صف کشی کس پہ ہے اے سپہ ناہنجار!　　قتل سادات کی لشکر میں یہ کیسی ہے پکار
وطن آواروں پہ یہ قہر ہے کیوں پانی کا
کیا زمانے میں یہی طور ہے مہمانی کا

مجھ کو لڑنا نہیں منظور یہ کیا کرتے ہو　　تیر جوڑے ہیں جو تم نے تو خطا کرتے ہو
کیوں نبی زادے پہ غربت میں جفا کرتے ہو　　دیکھو اچھا نہیں یہ ظلم، برا کرتے ہو
شمع ایمان ہوں اگر سر مرا کٹ جائے گا
یہ مرقع ابھی اک دم میں الٹ جائے گا

یہ قبا کس کی ہے، بتلاؤ یہ کس کی دستار　　یہ زرہ کس کی ہے، پہنے ہوں جو میں سینہ فگار
بر میں کس کا ہے یہ چار آئینہ جوہر دار　　کس کا رہوار ہے یہ آج میں ہوں جس پہ سوار
کس کا یہ خود ہے، یہ تیغ دو سر کی ہے
کس جری کی یہ کماں ہے، یہ سپر کس کی ہے

مجھ کو ہوتا نہ اگر بخشش امت کا خیال　　روک لیتا مجھے رستے میں یہ حر کی تھی مجال
تھام سکتا تھا لجام فرس برق مثال　　پوچھ لو دیکھا ہے اس نے مرے شیروں کا جلال
گفتگو میں سپر اس کی جو نہ ہم ہو جاتے
ہاتھ اک وار میں پہنچوں سے قلم ہو جاتے

غیظ سے ہونٹ چباتے تھے علی کے دلدار　　تیغیں تولے تھے عون و محمد ہر بار
انگلی پڑتی تھی جگر بند حسن کی تلوار　　میں نے جب سر کی قسم دی تو رکے وہ جرار
چلتی تلوار تو جنگل تہ و بالا ہوتا
پھر نہ حر خلق میں ہوتا نہ رسالہ ہوتا

تھا بپھرا ہوا عباس مرا شیر جواں　　سینۂ حر پہ رکھے دیتا تھا نیزے کی سناں
میں یہ کرتا تھا اشارہ کہ نہ اے بھائی جاں!　　رحم لازم ہے ہمیں ہم ہیں امام دو جہاں
کچھ تردد نہیں سر تن سے اتارا جائے
کوئی بندہ نہ مرے ہاتھ سے مارا جائے

گرچہ یہ امر نہیں اہلِ سخا کے شایاں — کہ کسی شخص کو کچھ دے کے کرے بیت عیاں
پوچھو تو حشر کو ہے موجود عیاں راجہ بیاں — اسی جنگل میں مع فوج تھا یہ تشنہ دہاں
شور تھا "آج جلیں جسم سے جانیں سب کی
منھ سے باہر نکل آئی تھیں زبانیں سب کی

زیست ہر شے کی ہے پانی سے شجر ہو کہ بشر — مجھ سے دیکھا نہ گیا، میں تو سخی کا ہوں پسر
میں نے عباس دلاور سے کہا گھبرا کر — مشکوں والے ہیں کہاں، اونٹ ہیں پانی کے کدھر
کرم ساقیٔ کوثر کو دکھا دو بھائی
جتنا پانی ہے، وہ پیاسوں کو پلا دو بھائی

رہ نہ جائے کوئی گھوڑا، کوئی ناقہ بے آب — چھاگلیں جلد منگاؤ، مرا دل ہے بے تاب
سقے مشکیزوں کے منھ کھول کے آپہنچے شتاب — متوجہ ہوا میں خود کہ وہ تھا کارِ ثواب
چین آیا نہ مجھے بے انھیں آرام دیے
تھا جو اک جام کا پیاسا اسے دو جام دیے

....

ایک دن وہ تھا اور اک دن ہے یہ اللہ اللہ — کہ اسی طرح ہیں پیاس میں پانی کی ہے چاہ
چشمِ امید ہو کیا سب نے پھرا لی ہے نگاہ — کوئی اک جام بھی بھر کر ہمیں دیتا نہیں آہ
ہر مسلماں پہ نبی زادے کا حق ہوتا ہے
بچے روتے ہیں تو سینہ مرا شق ہوتا ہے

کئی طفل ان میں ہیں ایسے کہ موئے جاتے ہیں — دم اکھڑتا ہے مرا جب انھیں غش آتے ہیں
پانی! پانی! جو وہ کرتے ہیں تو ہم شرماتے ہیں — پاس دریا ہے، یہ اک بوند نہیں پاتے ہیں
سچ ہے نوبت کی عجب شام و سحر ہوتی ہے
تیسرا دن ہے کہ فاقوں میں بسر ہوتی ہے

شہ کی مظلومی پہ گریاں ہوئی ظالم کی سپاہ — عمر سعد نے کی پھر کے رُخِ حُر پہ نگاہ
بولا وہ "اشہد باللہ سچ کہتے ہیں شاہ — محسن و منعم و آقا ہے مرا یہ ذی جاہ

ان کے احسان کا کیوں کر کوئی منکر ہو جائے
حق حق میں جو شک لائے وہ کافر ہو جائے

یہ اٹھیں ہاتھ اگر ہو دعا فرمائیں | جتنے عالم کے گنہگار ہیں بخشے جائیں
حق سے جس شے کے طلبگار ہوں فوراً پائیں | جسم کو تربتیں فردوس سے حوریں لائیں
مثل خورشید ہے روشن وہ شرف ان کا ہے
یہ وہ بندہ ہیں کہ اللہ پہ حق ان کا ہے

حُر کی گفتگو سے عمر سعد یہ سمجھ گیا کہ یہ لشکر سے نکل کر فوج حسینی میں شامل ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ عمر سعد نے جس جس طرح حُر کو اس کار نیک سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور جس جس عنوان سے اُسے ڈرایا دھمکایا ہے۔ وہ میر انیس نے پورے فن کارانہ طور پر بیان کیا ہے۔ یہاں صرف ایک بند نقل کیا جاتا ہے۔ جس سے اس ذہنیت پر روشنی پڑتی ہے جس نے یزیدیوں کو نبی زادے کے قتل پر آمادہ کیا تھا۔ عمر سعد حر کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

خوف کس بات کا پیاسوں سے یہ تھرّا کیا؟ | لب پہ ہر مرتبہ بیکس کی ثنا لانا کیا
ننگ کی بات ہے، دشمن کی طرف جانا کیا؟ | ہو نبی یا کہ وصی، جنگ میں شرمانا کیا
ابھی لے جائیں جو شبیر کا سر ہاتھ لگے
خلد ہم اس کو سمجھتے ہیں کہ زر ہاتھ لگے

میر فصیح | غلط نہ ہوگا اگر ہم اسی سلسلے میں میر فصیح کے ایک مرثیہ سے کچھ بند پیش کر دیں جس سے یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ کربلا کی قربانی اور اس کے بعد حضرت علی بن الحسین امام چہارم کی بذات خود اسیری اور طوق و سلاسل میں گرفتار، بے مقنع و چادر، ماں، بہنوں، پھوپھیوں کے ننگی پیٹھ اشتروں پر سوار غم زدہ قافلے کی ساربانی اور قید و بند کی صعوبتیں خاموشی و صبر سے ایک سال جھیلنے کے بعد رہائی ہمارے لئے کردار و سیرت کی وہ بے مثل مثال ہے جس سے انسانیت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سبق حاصل کرتی رہے گی۔

میر فصیح کے مرثیہ میں وہ موقع ہے کہ جب یہ لٹا ہوا قافلہ کوفہ سے شام کی طرف روانہ ہونے والا ہے۔ امام زین العابدینؑ کے گلے میں طوق خاردار اور پاؤں میں موٹی موٹی زنجیریں پڑی ہیں اور امام تپ شدید کے عالم میں، پشت اقدس پر کوڑے کھاتے ہوئے چلے جا رہے ہیں، چار یا پانچ برس کے، ان کے فرزند امام محمد باقرؑ اپنی کمسنی کی وجہ سے اپنے پدر بزرگوار کی یہ حالت دیکھ کر بلبلا اٹھتے ہیں۔ اور پوچھ بیٹھتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ آپ میں ساری روحانی قوتیں موجود ہیں اور آپ کو اس پر قدرت حاصل ہے کہ آپ چاہیں تو یہ حالات بدل جائیں، مگر آپ کیوں اس ابتلا کے برداشت کرنے پر صابر و شاکر ہیں؟ ——— امام چہارم جواب میں جو کچھ فرماتے ہیں وہ فصیح سے سنئے:۔

کہا رو کے باپ نے اے پسر! تو امام زادہ ہے صبر کر — یہی ذلتیں ہیں شرف ترا، نہ ملول ہو، نہ ہو چشم تر
اسی زندگی میں تو ہے مزا، کہ جو موت سے بھی ہو تند تر — نہیں سر کٹانے میں برتری، نہیں ناگوار وہ [illegible]

ہمیں ہر نفس دمِ تیغ ہے، ہمیں ہر قدم پہ جہاد ہے
یہی درد اپنی پسند ہے، یہی رنج اپنی مراد ہے

یہ خدا کا فضل ہے شکر کر، یہ لقب بھی فوزِ عظیم ہے — نہ تو ذلیل ہے نہ حقیر ہے، نہ پدر علیل و سقیم ہے
یہ تفضّلاتِ کریم ہے، یہ عطائے ربِّ رحیم ہے — دلِ داغدار تو باغ ہے، یہ سموم بادِ نسیم ہے

نہ یہ زخم کھانے میں ہے مزا، نہ جلاد ہیں یہ جری ہیں!
کہیں کیا جو ملتی ہیں لذتیں ہمیں تازیانوں کی ضرب میں!

یہ جو تیرے تن سے دہک رہا، یہ بدن جو تپ سے نڈھال ہے — یہی دل کی عین مراد ہے، کہ یہ اپنا جاہ و جلال ہے
ہے جو ضعف و غش کی زیادتی، یہی اپنا فضل و کمال ہے — رُخِ زرد و دیدۂ خوں فشاں، یہی اپنا حسن و جمال ہے

یہ ہے دستہ سنبلِ تازہ کا، سرِ دست بھی جو مہار ہے
نہیں سلسلہ یہ ہے "بدنما" یہی طوق پھولوں کا ہار ہے

میر نفیس

۴۔ میر نفیس نے ایک مرثیہ میں متعدد حملوں کا ذکر کیا ہے۔ جب فوج اشقیا بھاگ گئی تو امام نے تلوار روک لی۔ اور ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ آئیے میر نفیس کی زبان سے سنئے۔ اصل مقصد جنگ کرنا نہ تھا۔ بلکہ امت کو راہِ حق دکھانا۔

پڑھ کے لاحول ولاقوۃ الا باللہ — مسکراتے تھے ادھر سبطِ رسول ذی جاہ
پونچھ کر رخ سے پسینے کو یہ فرماتے تھے شاہ — تھا اسی رزم، اسی عزم سے دعوئ بخشش واہ
جو تعلّی نہ کرے صاحب جوہر وہ ہے
رخ نہ میداں سے پھرے جس کا دلاور وہ ہے

ہے وہ کرار جری جس کے قدم میں ہو ثبات — دیکھ لو لاشوں کے پل بندھ گئے تا نہر فرات
ہم کو کن فاقوں میں گزرے کئی دن اور کئی رات — آج حیدر کے گھرانے کی مگر رہ گئی بات
تم نے احمد کے نواسے کی وغا دیکھ تو لی
خیر، دو روز کے پیاسے کی وغا دیکھ تو لی

پاس ہوتا مجھے نانا کی نہ امت کا اگر — چھوڑتا ایک کو تم میں سے نہ زہرا کا پسر
بھاگتا پھرتا ہے اک تیغ سے سارا لشکر — تم ہو سب اہل جفا، ننگِ عرب، بانیٔ شر
شیر ہیں وقتِ وغا لختِ جگر حیدر کے
یوں بھگا دیتے ہیں فوجوں کو پسر حیدر کے

اس لڑائی کا رہا حشر تلک اب مذکور — قتل ہوں راہ میں اس کی یہی اب ہے منظور
ہے شہادت تو گھرانے کا ہمارے دستور — جس قدر زخم لگیں قلب کو ہوتا ہے سرور
یہ تمنا ہے کہ خالق پہ فدا ہو جاؤں
آج سر دے کے شریکِ شہدا ہو جاؤں

حق پہ حمزہ سے دلاور نے شہادت پائی — جنگ میں حضرت جعفر نے شہادت پائی
گھر میں اللہ کے حیدر نے شہادت پائی — زہر سے میرے برادر نے شہادت پائی
سب عزیز و رفقا مر گئے مغموم ہوں میں
آج ان سب سے سوا بیکس و مظلوم ہوں میں

ان شہیدوں میں نہ پیاسا کوئی یوں قتل ہوا
سامنے ان کے نہ پردیس میں گھر ان کا لٹا
یہ شہادت مری خاطر ہے سعادت بخدا
مگر اس ظلم کا نانا سے کروں گا شکوا

بے گنہ اہلِ شقاوت نے مجھے قتل کیا
تشنہ لب آپ کی امت نے مجھے قتل کیا

مجھے یقین ہے کہ جہاں ان مثالوں سے قربانیٔ کربلا کے اصل مقاصد اور اس کے دیرپا اور دور رس نتائج ناظرین پر واضح ہو گئے ہوں گے، وہاں انھوں نے یہ بھی ملاحظہ کر لیا ہوگا کہ نبی زادوں نے باوجود قدرت رکھنے کے کسی مافوق بشری قوت و طاقت کا استعمال نہیں فرمایا اور گو سامعین کو اس کا یقین ضرور ہے کہ یہ ان ہادیانِ طریقت کا دل گردہ تھا کہ باوجود اختیار و قدرت کے اس طرح کی جفائیں، مظالم ایذائیں اور ذلتیں برداشت کرتے رہے لیکن اسی کے ساتھ ہی سامعین ان کے اعلیٰ کردار سے طرح سبق حاصل کرتے ہیں اور ان کے اسوۂ حسنہ پر چلنے اور ان کی تاسی کرنے کی اسی طرح کوشش کرتے ہیں جس طرح ہر مسلمان پیغمبر اسلام کے سوانح حیات سُن کر اور ان کو اپنے سے ہزار درجہ رفیع و اعلیٰ تسلیم کرتے ہوئے ان کی تاسی و تقلید کی حتی الامکان سعی کرتا ہے۔ کون ایسا مسلمان ہے جو اپنے پیغمبر کی معجزنمائی کا قائل نہیں ہے؟ کون ہے جو ان کی مافوق طاقت بشری قوت و قدرت کا قائل نہیں؟ مگر کیا وہ اس اعتقاد کے باوجود، جو اس کے ایمان کا جزو ہے، حضرت رسول مقبول کی تاسی سے اور ان کے اسوۂ حسنہ کی پیروی سے روگردانی کی مجال رکھتا ہے؟ اور ایسا نہ کرنے کی حالت میں کیا وہ عاصی خطا کار، گنہ گار، سمجھے اور کہے جانے سے انکار کرنے کی جرات کر سکتا ہے؟

اس لئے نہ تو مرثیہ نگاروں پر اعتراض درست ہے اور نہ مرثیہ کے سامعین و ناظرین پر کہ وہ امام حسین کی مافوق بشری قوت و طاقت و قدرت کے قائل ہونے کی وجہ سے ان کی اور دیگر شہدائے کربلا کی تاسی کا خیال تک دل میں نہیں لا سکتے ہیں۔ اگر اسی منطق سے کام لیا گیا تو ہر مذہبی پیشوا کے ننانوے فیصدی پیرو اپنے اپنے مذاہب کے ماننے والے باقی نہ رہ جائیں گے۔

(۵) (الف) اعتراض ہے کہ رزمیہ لطف اسی وقت آتا ہے جب برابر کی جوڑ ہو

مگر مرثیہ گو ہاتھی اور پشہ کا مقابلہ دکھاتے ہیں"

حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، ہر حریف پیل دماں اور رستم زماں بن کر آتا ہے مگر ہزیمت کھاتا ہے۔ یہ شکست آسانی سے نہیں ہوتی، خاصی جنگ ہوتی ہے، مختلف حربوں کا استعمال ہوتا ہے مگر بنی ہاشم میں سے ہر ایک ماہر فن سپہ گری تھا اس لئے ہزیمت یقینی تھی، ہر مرثیہ گو کا یقینی یہ ایمان ہے کہ آل رسول کو وہ قوت روحانی و جسمانی عطا ہوئی تھی کہ اگر وہ چاہتے تو عمر سعد کی پوری فوج پر بہ آسانی غالب آسکتے تھے۔ لیکن وہ اپنی اس قوت اور طاقت کا اظہار اس موقع پر منشائے الہٰی کے خلاف سمجھتے تھے اور رضائے الہٰی کے منافی۔ ہم جو پیروں، ولیوں، صوفیوں، درویشوں، رشیوں، منیوں کے روحانی کمالات و کرامات کے قائل ہیں، کیا اپنے نبی زادے کو، جس کی تربیت و تعلیم پیغمبر آخر الزماں کے آغوش میں ہوئی ہو، ان کے جیسا بھی صاحب قدرت و کرامت نہیں تسلیم کر سکتے؟ کیا علاؤالدین خلجی کے عہد میں ایک خرقہ پوش بزرگ کے فصیل قلعہ سے ایک کنکری پھینک دینے سے مغلوں کی دو لاکھ سے زاید فوج رات ہی رات فرار کر سکتی تھی۔ لیکن نواسۂ رسول اور اس کے صالح، متقی، عابد، زاہد، عالم و دانا بھائیوں، بیٹوں کی زبان و بازو سے یہ قوت سلب کر لی گئی تھی کہ وہ دعاؤں کے زور سے یا دست و بازو کی طاقت سے عمر سعد کی بیس تیس ہزار کی فوج کو میدان سے بھگا دیں؟ مرثیہ گو کا یہ اعتقاد ہے کہ وہ یقینی ایسا کرنے پر قادر تھے۔ اور خیبر شکن کے بیٹے اور پوتے تھے۔ ان میں قوت روحانی کے ساتھ ساتھ قوت جسمانی بھی تھی۔ مگر وہ صبر کا امتحان دینے آئے تھے، اور اسلام کی بقا کے لئے اپنی قربانی پیش کرنے آئے تھے —— وہ حق پرستی کی ایک لافانی مثال عالم کے سامنے پیش کرنے آئے تھے اس لئے انھوں نے جنگ کی تو محض دفاعی، مگر جب وہ لڑنے لگتے تو فن جنگ میں ان کی مہارت علی جری ہی جیسی دکھائی دیتی تھی اور فوج یزیدی کے بڑے بڑے تیغ زن ان کا مقابلہ کر کے شکست کھا جاتے تھے۔ یہی حقیقت حال مرثیہ گویوں نے اپنے شاعرانہ ڈھنگ سے بیان کی ہے۔

مصطفیٰ حسین گوہر | (الف) جنگ مغلوبہ میں اصحاب کی بہادری

امام حسینؑ اور ان کے خانوادہ کی تیغ زنی و جوانمردی کا سکہ تو دلوں پر بیٹھا ہی تھا "اصحاب حسینؑ" بھی اپنی معرکہ آرائی کے لئے مشہور عالم تھے۔ ان کی جرأت و پامردی کا اندازہ صبح عاشور کی جنگ مغلوبہ سے بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے۔ جناب گوہر نے اپنی مثنوی "پیکار کربلا" جو موثق تاریخوں کے حوالے سے لکھی گئی ہے اور زیر طبع ہے، اس جنگ کا حال یوں بیان کیا ہے۔ جب صبح کو صف آرائی ہوتے ہی ہلال بجلی امام حسینؑ کی طرف جنگ کرنے نکلے اور بہت سے شامیوں کو مار کر شہید ہو گئے تو ان کا جوان بیٹا نافع ابن بجلی میدان میں آیا۔

نکلا مزاحمت کو مزاحم[۵] سا دیں فروش — نافع کے ایک وار میں غائب تھے عقل و ہوش
پھر ہاتھ دوسرا جو مجاہد کا چل گیا — سر کٹ گیا، وہ جنگ کا سودا نکل گیا
دیکھا یہ رنگ تو ہوئے دنگ، خیرہ سر — چلّایا اپنی فوج کو حجاج کا پسر
"خالی ہو عقل و ہوش سے تم اے دلاورو! — اک ایک کرکے جنگ نہ ان سے تم کرو
معلوم ہے کہ کون ہیں یہ آزمودہ کار؟ — اک ایک ان دلیروں میں ہے فخر روزگار
ان کو نہ فکر جان کی، نہ موت کا ہے ڈر — سیراب ہوتے یہ تو نہ ہوتی ہمیں مفر
بہتر ہے ان پہ حملہ کرو پوری فوج سے — چٹان ٹوٹ جاتی ہے دریا کی موج سے
ہلچل ہوئی، گھٹا بڑھی، سیلاب آگیا — گھوڑے بڑھے، دھمک ہوئی، دل تھرتھرا گیا
جھنکار اسلحوں کی، لگاموں کی وہ کھڑک — چنگھاڑ دیوزادوں کی، کڑکیت کی کڑک
چلنا ہوا کو راستہ دشوار ہو گیا — اٹھا غبار دن بھی شب تار ہو گیا
ٹوٹا وہ میسرہ پہ لیے اپنی فوج جب — شمر لعیں کی فوج بھی آ پہنچی درعقب
پیچھے نہ رہ سکا عمر و سعد بے حیا — لے کر وہ فوج خاص کو اپنی جھپٹ پڑا

---

۵ بنی قطیعہ کا مشہور پہلوان ہے۔ ۲ عمرو ابن حجاج زبیدی عمرو ابن سعد کے لشکر کا سردار میمنہ

بغض نبی و خویش نبی دل میں تھا بھرا — ناری کا رخ خیام مقدس کی سمت تھا
خندق میں تھی جو آگ بھڑکتی، ٹھہر گیا — تھا دوزخی تو دیکھ کے شعلوں کو ڈر گیا
غیرت دلا کے شیث بھی چلایا "شرم کر!" — مطلق نہیں خدا و پیمبر کا تجھ کو ڈر؟
ظالم نہ کر تباہ ریاضت بتول کی — ان خیموں میں نواسیاں ہونگی رسول کی
نفرت اٹھا کے پلٹا ادھر سے جو بزدلا — تھیں حملہ ور جو فوجیں اکھٹی، میں وہ آملا
ان سب کے بھی بنائے مگر کچھ نہ بن پڑا — انصار ڈٹ گئے، تو قیامت کا دن پڑا
اپنی مثال آپ تھا اصحاب کا یہ جوش — بڑھ بڑھ کے لڑ رہے تھے برابر وہ سرفروش
وہ مارتے تھے نیزے جو گھٹنوں کو ٹیک کے — ہٹ جاتی تھی قطار مقابل سے ایک کے
کوئی کماں سے تیر چلاتا تھا بار بار — تھی ہاتھ میں کسی کے کھنچی تیغ آبدار
خوں بہ رہا تھا چار طرف مار دھاڑ تھی — پھرتی تھی موت، زیست کی بستی اجاڑ تھی
ڈھالوں پہ روکتے تھے اگر ضرب نابکار — دو ٹکڑے یوں وہ ہوتی تھی جیسے ہو تر خیار
کیا تاب تھی جو روک سکے خود تیغ کو — پیالہ ہو جیسے موم کا، ہوتا تھا صاف دو

بھولے ہوئے تھے پیاس عجب واردات تھی — پھرتی یہ تھی کہ موت کی رفتار مات تھی
زخمی پھڑک رہے تھے برابر ادھر ادھر — گھوڑے بھڑک رہے تھے سراسر ادھر ادھر
چیخا کوئی کہ "ہائے مرا ہاتھ کٹ گیا" — تڑپا کوئی کہ "ہائے جگر میرا پھٹ گیا"
کوئی پکارا "اف، مرا بازو کدھر گیا؟" — گردن ذرا ابھاری تو شانے سے سر گیا
کٹ کٹ کے گر رہے تھے جو مردان جنگجو — حد نگاہ تک تھا برابر، لہو، لہو!
دل سرکشوں کے بیٹھ گئے ہول جنگ سے — اصحاب لڑ رہے تھے اسی ایک رنگ سے

تکبیر کی صدا کبھی تہلیل کی صدا
جرأت پکارتی تھی "ہیں کہتے اسے وغا"

طبری[1] نے اس مقام پہ ہے اس طرح لکھا — یہ حملۂ شدید جو، ناکام، ہو گیا
شمر و عمر دلوں میں بڑے شرمسار تھے — بے سر پڑے زمیں پہ ہزاروں سوار تھے

---

[1] مورخ جس کی تاریخ طبری مشہور ہے

آواز میسرہ کو عمر نے دی جلد آؤ   حملوں سے ان دلیروں کے ہم لوگوں کو بچاؤ
سنتے ہی حملہ ور ہوا لشکر کے میسرہ   سردار اس گروہ کا بیٹا تھا قیس[1] کا
اصحاب باوفا نے نہ بڑھنے مگر دیا   واللہ موذیوں کو پراگندہ کر دیا
دنیا میں بے مثال ہے ایسی بہادری   تعداد ان دلیروں کی کہتے ہیں ساٹھ تھی
دیکھا فلک نے اور زمیں نے نہ یہ سنا   لیں ساٹھ بھوکے پیاسے ہزاروں سے مورچا
تاثیر سب یہ الفت شاہ زمن کی تھی   نصرت خدا کی اور مدد پنجتن کی تھی
تب شبث[2] کو پکار کے کہنے لگا عمر   ہاں اپنے پیدلوں کو بڑھا اب نہ دیر کر
ہمراہ لے کے جلد کماں دار دس ہزار   کر دے انھیں جو چھلنی ابھی تیر مار مار
بولا بگڑ کے شبث مجھے انحراف ہے   اس حکم سے عیاں مری توہین صاف ہے
اس طرح حملہ کرنا ہے بزدلوں کا کام   میں شیخ فوج ہوں نہیں تیرا کوئی غلام
ابن نمیر[3] سے کہا پھر اس نے چیخ کر   لا جلد پہلوانوں کمانداروں کو ادھر
ننگ عرب تھا گرچہ لڑائی کا یہ شعار   لے کر قریب پہنچا کماں دار دس ہزار
کڑکیں کمانیں چھا گئی میدان میں گھٹا   سینہ سپر مگر تھے جوانان باوفا
بوندوں کی طرح تیر پڑے رزمگاہ میں   دنیا سیاہ ہو گئی، سب کی نگاہ میں
پھر بھی ہٹے نہ ناصر سلطان کربلا   گھوڑے ہوئے شہید، ہوئے سب پیادہ پا
نعرے یہ تھے ہٹیں گے جگہ ہم نہ چھوڑ کر   پھینکے غلاف تیغوں کے بس توڑ توڑ کر

سیلاب فوج شر تھا کہ دریا کی ایک رو   مارے جہاں سے جاں نثار تو آ پہنچے واں پہ سو
لکھا ہے ایک تھا ابو عذرہ[4] سیاہ کار   شمر لعیں کا خاص مصاحب تھا نابکار
بڑھ بڑھ کے کر رہا تھا جو حملے وہ خیرہ سر   پھینکا اسے زہیر نے نیزے سے چھید کر
چلائے اہل کوفہ یہ کیسا غضب ہوا   شمر لعیں بھی زور سے چیخا غضب ہوا

---

[1] عروہ ابن قیس، رئیس کوفہ ۱۲ [2] ۲۴ ہزار پیادوں کا سوار تھا۔ [3] حصین ابن نمیر تمیمہ کوفہ اپنی تیراندازی کے لئے سارے عرب میں مشہور تھا [4] شمر کا عزیز خاص ۱۲

پیچھے ہٹے شکست اٹھا کے وہ زشت خو — دہشت سے رنگ اڑ گیا اور جم گیا لہو
منھ گرچہ تھے کھلے ہوئے ہلتی نہ تھی زباں — دل ہل رہے تھے بھول گئے لن ترانیاں
کم ہو گئے ہزار جواں فوج شام سے — لرزاں تھے سنگ دل بھی لڑائی کے نام سے

اصحاب شاہ دیں میں کیا جب گھڑی شمار — تھے خون میں نہائے ہوئے تیس نامدار
چہرہ ہر اک کا رشک وہ لالہ زار تھا — زخموں کے گل کھلے تھے غضب کا نکھار تھا
سردار کے نثار، تصدق سپاہ کے — گننے دیا نہ زخم، عزیزوں کو شاہ کے

جب یہ معرکہ آرائی، جنگجوئی اور بہادری کا مظاہرہ اصحاب امام کر سکتے تھے، تو خانوادہ ابوطالب، جو اپنی جرأت و قوت و تیغ زنی کے لئے پورے عرب میں ممتاز تھا اس کے لئے دس بیس نامی پہلوانوں کا مار لینا کون سی بڑی بات تھی۔ ان کے سردار حسینؑ ابن علی تھے، جنھوں نے روحانی کمالات کے ساتھ ساتھ جسمانی قوت اور فوجی فنون اور حربوں کا استعمال اپنے جد و اب سے ورثہ میں پایا اور حاصل کیا تھا ان کے علمبردار حضرت عباس تھے، جو اپنے حسن صورت و سیرت اور اپنے قد و قامت کی وجہ سے "قمرِ بنی ہاشم" کہلاتے تھے اور اس وقت کے عرب کے تین مشہور ترین شمشیر زنوں میں سے ایک تھے، لوگ ان کے نام اس قدر ڈرتے تھے کہ ان کا تنہا مقابلہ کرنے کے لئے معرکۂ کربلا میں کوئی نہیں آیا۔ انھیں حضرت عباس نے دوسرے جوانان بنی ہاشم کو فنون جنگ سکھائے تھے۔

سید غلام امام

دیکھیے حضرت عباس خاندان کے نوجوانان بنی ہاشم کو فنون حرب کیوں کر سکھاتے تھے۔

(جناب غلام امام صاحب کے ایپک سے ایک اقتباس)

جمع ہوتے تھے جوانان مدینہ ہر روز — بیچ میں حضرت عباس تھے جلوہ افروز
خیر سی چتونیں انداز تکلم، دل سوز — نوجوانوں سے بھی آگے تھے جو بچے تھے ہنوز

چوم کر کہتے تھے سب صفدر و جرار کا ہاتھ
آپ کا ہاتھ تو ہے حیدر کرار کا ہاتھ

بند نیزے کے کبھی باندھ کے کھولے دو چار — مسکراتے ہوئے گہ ہاتھ میں لے لی تلوار

وار خود کر کے دکھایا اور بتایا کئی بار | تیر جس طرح سے بچوں کو سکھاتا ہے شکار

مشق میں ہاتھ نکالا جو کسی نے دل خواہ
آپ تعریف میں فرماتے تھے ماشاء اللہ

دیکھو آنے لگے اصطبل سے سج کر تازی | کر کے تسلیم چڑھے گھوڑوں پہ اپنے غازی
قاسم و اکبر ذی جاہ کی تیر اندازی | حاصل ان کو بھی ان کو ہوئی سرافرازی

آپ تعلیم بہ صد جاہ و حشم کرتے ہیں
تیر کو تیغ سے کس طرح قلم کرتے ہیں

خود حضرت عباس کو جنگ کرنے کی باقاعدہ اجازت نہ ملی۔ جب وہ آخری بار دریا کی طرف چلے ہیں تو محض اس لئے کہ اپنی چہیتی بھتیجی سکینہ اور دوسرے پیاسے بچوں کے لئے ایک مشک پانی لائیں۔ چنانچہ بجائے اسلحے کے علم کے ساتھ ساتھ ایک مشک کا بار بھی بڑھ گیا اور روایتوں میں ہے کہ آپ اپنے ساتھ تلوار اور تیر و کمان بھی نہیں لے گئے تھے۔ بس ایک نیزہ ہاتھ میں تھا اور ایک سپر۔ اس پر آپ کے شیرانہ حملے سے سپاہ شام اس طرح پسپا ہوئی کہ آپ فرات تک پہنچ گئے اور آپ نے مشکیزہ بھر لیا۔ اب نشیب سے بلندی پر چڑھنا تھا۔ اور اشقیا نے پورے ساحل پر ہجوم کر رکھا تھا اب پتھر بھی پھینکے جا رہے تھے۔ یہاں صرف یہ فکر تھی کہ سارے وار جسم پر لے لئے جائیں لیکن مشک تک کوئی پتھر، تیر یا بھالا نہ پہونچنے پائے۔ یونہی مقابلہ کرتے ہوئے فراز ساحل تک پہنچ گئے۔ اور ہر طرف حملے ہونے لگے یہاں تک پہنچ گئے اور ہر طرف سے حملے ہونے لگے۔ یہاں تک کہ ایک شقی کے وار سے داہنا ہاتھ کٹ کر گرا اور اس کے ساتھ نیزہ گر گیا۔ پھر بھی نہ علم حسینی گرا اور نہ مشکیزۂ سکینہ، لیکن کہاں تک ایک ہاتھ کام کرتا۔ اب تو صرف سپر تھی۔ اس سے اپنے کو نہیں بلکہ مشک کو بچاتے رہے۔ ایک اور بھرپور وار پڑا۔ اور دوسرا ہاتھ بھی شہید ہوا۔ وہ گرا تو سپر بھی گر گئی۔ مگر واہ رے دلاوری۔ دانتوں سے مشک کے تسموں کو پکڑ کے اس پر اس طرح جھکے کہ سینہ سپر ہو گیا۔ ایک ظالم نے پشت سے آ کر سر اقدس پر گرز مارا۔ ساتھ ہی دوسرے نے مشکیزہ پر تیر مارا اور پانی بہنے لگا۔ حضرت عباس نے آہ کی اور پشت زین سے زمین پر تشریف

لائے۔ اب اگر مرثیہ گو اس جرات، پامردی، وفاکیشی، تیغ زنی اور نبرد آزمائی کی داستان
کو شاعرانہ لفظوں میں بیان کرتے ہیں، تو مؤرخین جنھوں نے نہ مقاتل کا مطالعہ کیا ہے
اور کتب سیر کی ورق گردانی، جو نہ عرب کے طریقۂ جنگ سے واقف ہیں، اور نہ ان
کے اسلحوں کے استعمال نہ ان کے بیان کردہ مرقعات جنگ، نبرد آزمائیوں اور دست
بدست معرکہ آرائیوں پر "ہاتھی اور پشہ" کے مقابلے کا الزام وارد فرماتے ہیں
تو ہمیں بیک وقت رنج بھی ہوتا ہے اور غصہ بھی آتا ہے۔ جسارت اور دریدہ دہنی
کی بھی، مہذب اور پڑھے لکھے لوگوں کے نزدیک ایک حد ہوتی ہے کسی فن، کسی
علم یا کسی تاریخی واقعہ سے کماحقہ واقف نہ ہونا اور اس پر نکتہ چینی اور اعتراض
کرنا نہ تہذیب ہے، نہ اخلاق، نہ ادب، اور نہ سچا نقد۔"

بہرحال یہ وہ برگزیدہ اور منتخب ذاتیں تھیں جن کی تلوار کا لوہا اطراف
و اکناف عرب میں مانا جاتا تھا اور جن میں سے اکثر کی ضربت حیدری
زباں زد خاص و عام تھی۔

پھر بھی مرثیہ گویوں نے مبارز طلبی کے بعد ان کے مقابل کی جسارت، قد و قامت،
تیغ زنی و نیزہ بازی کے بیان میں کوتاہی نہیں کی ہے ان کی آمد اس ہیبت اور دہشت انگیزی
کے ساتھ دکھائی ہے کہ ناظر کو اس کا یقین ہو جاتا ہے کہ اب امام حسین کی طرف سے لڑنے
والے مجاہد کی خیر نہیں۔ مگر فنون جنگ میں ان کی کامل مہارت، حق پر ہونے کا یقین، درس شہادت،
امام کا جوش ان کو ایک غیر معمولی قوت و ہمت عطا کر دیتا ہے اور وہ جو ظاہر بیں نگاہوں
میں کمزور، نحیف اور بھوک پیاس سے حد درجہ دکھائی دیتے تھے۔ وہ تھوڑے ہی رد و بدل
کے بعد بیل دماں مقابل پر غالب آ جاتے ہیں۔ کتب سیر کا مطالعہ فرمائیں سوائے محدودے
چند غلاموں کے کوئی بھی حسین کی طرف کا نامدار دست بدست لڑائی میں کسی
بڑے سے بڑے پہلوان کے ہاتھ سے شہید نہیں ہوا۔ جب مارا گیا تو نرغہ میں
گھیر کر، دور سے سنگ باراں کر کے، یا ایک اکیلے پر ہزاروں تیر برسا کر۔

خود امام حسین جو علاوہ زخم ہائے جسمانی کے بہتّر عزیزوں اور رفیقوں کی شہادت
سے مجروح اور بقول انیس حضرت کے "جن کے ہر بُن مو میں درد ہے" جب جنگ

کرنے یا جامِ شہادت نوش فرمانے آئے ہیں۔ تو انھوں نے ابتدا میں جو شیرانہ حملے کیے ان سے شامیوں کے قدم اکھڑ گئے اور عمر سعد پناہ مانگنے لگا۔ فرزند حیدرِ کرار نے فرار ہونے والوں کا پیچھا نہیں کیا۔ بلکہ لجام کھینچ کر ہانپتے ہوئے فرس کو دم لینے کا موقع دیا۔ فوج کی اس شکست پر عمر سعد کو بڑی خجالت محسوس ہوئی۔ پھر کیا ہوا، یہ میر انیس سے سنیے :

میر انیس

(ب)

چلّایا ہاتھ مار کے زانو پر ابن سعد
اے وا فضیحتا، یہ ہزیمت ظفر کے بعد
رہا دلاوروں کو نہیں ہے، خلاف وعد
اک پہلوان یہ سنتے ہی گرجا مثال رعد
نعرہ کیا کہ کرتا ہوں حملہ امام پر
لے ابن سعد! لکھ لے ظفر میرے نام پر

حریف پہلوانوں کا سراپا

یہ مدعی واقعی پہلوان تھا کوئی لپّہ نہ تھا میر انیس کی زبان سے سنئے :-

بالا قد و کلفت و تنومند و خیرہ سر
روئیں تن و سیاہ دروں، آہنی کمر
ناوک پیام مرگ کے ترکش، اجل کا گھر
تیغیں ہزار ٹوٹ گئیں جس پہ، وہ سپر
دل میں بدی، طبیعت بد میں بگاڑ تھا
گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا

تھا جسم نابکار سے عرصہ زرہ پہ تنگ
جوشن میں یوں تھا، دام میں ہو جس طرح نہنگ
خونخوار فتنہ ساز، دل آزار، خانہ جنگ
آنکھیں تو فرط غیظ سے سرخ اور سیاہ رنگ
تیوری چڑھائی دیکھ کے حضرت کو دور سے
آیا قریب سبط نبی، کس غرور سے

ساتھ اس کے اور اسی قد و قامت کا ایک یل
آنکھیں کبود، رنگ سیہ، ابروؤں پہ بل
بدکار رہوشیار ستم گار و پُر دغل
جنگ آزما، بھگائے ہوئے لشکروں کا دل
بھالے لئے، کسے ہوئے کمر ستیز پر
نازاں وہ ضرب گرز پہ، یہ تیغ تیز پر

لشکر میں اضطراب تھا، فوجوں میں کھلبلی سادات بے حواس، ہراساں وصی، ولی
ڈر تھا کہ اب حسین بڑھے، تیغ اب چلی غل تھا، ادھر ہیں مرحبؔ و عنترؔ، ادھر علیؑ
کون آج سربلند ہوا اور کون پست ہو
کس کی ظفر ہو دیکھئے! کس کی شکست ہو

جنگ

ج :-

نیزہ ہلا کے شاہ پہ آیا وہ خود پسند مشکل کشا کے لال نے کھولے تمام بند
تیر و کماں سے بھی نہ ہوا کچھ وہ بہرہ مند چلّا ادھر کھینچا کہ چلی تیغ سربلند
وہ تیر کٹ گئے جو دراتے تھے سنگ میں
گوشے نہ تھے کماں میں، نہ پیکاں خدنگ میں

ظالم اٹھا کے گرز کو آیا جناب پر طاری ہوا غضب، خلفِ بوتراب پر
مارا جو ہاتھ، پاؤں جما کر رکاب پر بجلی گری شقی کے سرِ پُرعتاب پر
بد ہاتھ میں شکست، ظفر نیک ہاتھ میں
ہاتھ اڑ کے جا پڑا کئی ہاتھ، ایک ہاتھ میں

کچھ دست پاچہ ہو کے چلا تھا وہ نابکار پنجے سے پر اجل کے کہاں بچ سکے شکار
واں اس نے بائیں ہاتھ میں لی تیغ آبدار یاں سر سے آئی پشت کے مہرے پہ ذوالفقار
قربان تیغِ تیز شہِ نامدار کے
دو ٹکڑے تھے سوار کے اور راہوار کے

ایک یل۔ وہاں تو یوں امام حسین کے ہاتھوں سے ختم ہوا، اب دوسرے کا کیا حشر ہوا، وہ بھی ملاحظہ کیجئے:-

پھر دوسرے پہ گرز اٹھا کے پکارے شاہ کیوں ضربِ ذوالفقار پہ تو نے بھی کی نگاہ
سرشار تھا شرابِ تکبر سے روسیاہ جاتا کہاں کہ موت تو روکے ہوئے تھی راہ
غل تھا، اُسے اجل نے بڑھایا جو گھیر کے
لو! دوسرا شکار چلا منہ میں شیر کے

آتا تھا وہ کہ اسپ شہ دیں پلٹ پڑا | ثابت ہوا کہ شیر گرسنہ جھپٹ پڑا
تیغ شقی نے ڈھال پہ مارا تو پٹ پڑا | ضربت پڑی کہ گنبدِ دوار پھٹ پڑا

پیوند صدر و زیں حبد دغرق ہوگیا
گھوڑا زمیں ہیں سینے تلک غرق ہوگیا

مگر اصل مقصد جنگ میں کامیابی نہ تھا، بلکہ اسلام کی بقا کے لیے قربانی پیش کرنا تھا اس لیے۔

آئی ندائے غیب کہ شبیر! مرحبا | اس ہاتھ کے لیے تھی یہ شمشیر، مرحبا
یہ آبرو، یہ جنگ، یہ توقیر، مرحبا | دکھلا دی ماں کے دودھ کی تاثیر، مرحبا

غالب کیا خدا نے تجھے کائنات پر
بس خاتمہ جہاد کا ہے تیری ذات پر

"بس اب کرو غا کی ہوس، اے حسین! بس | دم لے ہوا ہیں چند نفس، اے حسین! بس
گرمی سے ہانپتا ہے فرس، اے حسین! بس | وقت نماز عصر ہے، بس اے حسین! بس

پیاسا لڑا نہیں کوئی یوں ازدحام میں
اب اہتمام چاہیے امت کے کام میں

لبیک! کہہ کے تیغ رکھی شہ نے میان میں | پلٹی سپاہ، آ گئی قیامت جہان میں
پھر سرکشوں نے تیر ملائے کمان میں | پھر کھل گئے لپٹ کے پھریرے نشان میں

بیکس امام ظلم شعاروں میں گھر گئے
تنہا حسین لاکھوں سواروں میں گھر گئے

دیکھا آپ نے کہ جنگ میں کسی سے عاجز نہ ہونے کے باوجود وہی "اُمت کے کام" کا خیال مزید تیغ زنی سے مانع ہوتا ہے۔ یعنی دکھا دینا ہے کہ ہم قدرت رکھتے ہوئے بھی محض اس لیے قربانی پیش کرتے ہیں کہ تم اسے ملوکانہ جنگ نہ سمجھو اور ہمارے اسوۂ حسنہ پر چلنا انسانیت کا فروغ و فخر جانو۔

رزمیہ گی کامل مثالیں میر وحید کے مرثیوں میں بکثرت ملیں گی۔ مگر جو صفائی چابکدستی اور فنی صناعی میر انیس رزم کے بیان میں بھی دکھا جاتے ہیں، وہ کمیاب ہے۔

مثلاً حضرت قاسم ابن حسن کی فرزندانِ ازرق اور ازرق سے جنگ ملاحظہ ہو:۔

(۱) تیرہ برس کے قاسم ابن حسن نے رجز پڑھ کر جب فوج شام پر حملہ کیا تو کشتوں کے پشتے لگ گئے اور لشکر عمرو ابن سعد میں بھگدڑ مچ گئی۔ عمر وسعد نے گھبرا کر شام کے بہت ہی نامی پہلوان ازرق کو حکم دیا کہ وہ جناب قاسم کے مقابلے کے لئے جائے

تھا ابن سعد شوم کو اس دم بہت ہراس ۔۔۔ غرق صلاح ازرق شامی کھڑا تھا پاس

اس سے کہا کہ "فوج نہایت ہے بے حواس ۔۔۔ تو جا کے لڑ، تو قتل ہو شاید یہ حق شناس

رکتا ہے برچھیوں سے نہ دام کمند سے

جلدی سنان پہ اس کو اٹھا لے سمند سے

مگر ازرق کو یہ حکم خلاف شان محسوس ہوا، وہ شام کا نامی گرامی جنگ آزمودہ پہلوان، اور اس کو لڑنے کا حکم دیا جائے۔ ایک ایسے نوجوان سے جس کی مسیں بھی ابتک نہ بھیگی تھیں۔ چنانچہ اس حکم کو اپنی توہین سمجھا۔

کہنے لگا بگڑ کے باصد غرور ولاف ۔۔۔ تو آپ بے حواس سا ہے، ہووے قصور معاف

یہ امر، اے امیر! شجاعت کے ہے خلاف ۔۔۔ ہاں تب لڑوں، علی اگر آئیں پئے مصاف

فرق آئے گا کبھی نہ مری آن بان میں

لڑکے سے لڑ کے نام مٹا دوں جہان میں

اور اس نے اپنی تعریف میں ایک اچھا خاصہ مبالغہ آمیز قصیدہ پڑھ کر یہ تجویز پیش کی کہ اس کی بجائے اس کے لڑکے سے مقابلہ کرنے اور جناب قاسم کو ہزیمت دینے کے لئے بھیج دیا جائے۔

بیٹوں کو میرے بھیج کہ عیاروں دلیر ہیں ۔۔۔ جنگ آزما ہیں، سور ہیں، صفدر ہیں، شیر ہیں

لیکن جب یہ سورما، قاسم بن حسن سے ایک کے بعد ایک لڑنے آئے تو ہر ایک نے شکست کھائی اور عروس فنا سے ہمکنار ہوا۔ جب ازرق نے یہ حال دیکھا تو وہ رنج سے جل کر کباب ہوا، اور غصہ میں بل کھاتا ہوا بیٹوں کے خون کا بدلہ لینے **میدان جنگ** میں خود آ گیا۔

چاروں پسر جو رن میں ہوئے قتل یکبار — ازرق کا دل ہوا صفت لالہ داغدار
جوشِ غضب سے سرخ ہوئی چشم نابکار — مثل تنور منھ سے نکلنے لگا بخار
جیب قبا کو مثل کفن پھاڑتا ہوا
نکلا پرے سے دیو سا چنگھاڑتا ہوا

شانے پہ تھی شقی کے وہ دو ٹانک کی کماں — ارجن بھی جس سے سہم کے گوشے میں ہو نہاں
چار آئینہ وہ پہنے تھا بر میں کہ الاماں — دب جائیں جس کے بوجھ سے رستم کے استخواں
کہتے تھے یہ ذرے بدن بدخصال میں
پکڑا ہے شیر مست کو لوہے کے جال میں

ازرق واقعی اتنا بڑا پہلوان تھا کہ امام انام بھی گھبرا گئے اور انھیں بھتیجے کے مارے جانے کا خطرہ محسوس ہوا۔ دیکھیے مرثیہ گو نے امام کو بالکل ایک انسان اور ایک محبت کرنے والے چچا کی طرح پیش کیا ہے۔ حالانکہ وہ امام وقت ہونے کی حیثیت سے اس جنگ کا انجام جانتے تھے۔

آمد شقی کی دیکھ کے گھبرا گئے امام — عباس نامور سے بہ حسرت کیا کلام
"لو بھائی، جنگ ہو چکی، قصہ ہوا تمام — آیا سوئے یتیم حسن موت کا پیام
ہمشکل مصطفےٰ کو بلا لو پکار کے!
مانگو دعا سروں سے عمامے اتار کے"

فوجیں ذرا دعا کی چلیں سوئے آسماں — بل کھا کے اس طرف یہ پکارا وہ بدزباں
"رستم بھی ہو تو کھینچ نہیں سکتی مری کماں — جوشن کو توڑتا ہے مرا تیر بے اماں
ہے فتح اس کی ساتھ ہوں میں جس رئیس کے
شرمندہ کیا ہے دیو کو چٹکی میں پیس کے"

قاسم نے دی صدا کہ "بس اب کر زبان بند — اللہ کو غرور و تکبر نہیں پسند
حق نے فروتنی سے کیا مجھ کو سربلند — نیزے کا بند باندھ کوئی چھیڑ کر سمند
دیکھیں بلند کون ہے اور پست کون ہے
کھل جائے گا ابھی کہ زبردست کون ہے"

نیزہ ملا کے جانب قاسم بڑھا وہ بل — ڈڈھانے مسکرا کے صدا دی سنبھل سنبھل
گھوڑا نہ گر پڑے ترے لنگر سے منھ کے بھل — توہے فرس پہ اور تری گردن پہ ہے اجل
ضیغم ہیں بیٹے اسد ذوالجلال کے
کچھ بھی سناں کا وار ذرا دیکھ بھال کے

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سے نیزے کو دی نکال — چمکی انی تو برق پکاری کہ "الاماں"
ایک بند باندھ کر جو فرس سے کہا کہ ہاں — ڈانڈ آئی ڈانڈ پر، تو سناں سے لڑی سناں
بل کیا کرے کہ زور تھا موذی کا گھٹ گیا
غل تھا کہ "اژدھے سے وہ افعی لپٹ گیا"

قاسم نے زور سے جو انی پر رکھی انی — بھاگا شقی کے جسم سے زور تہمتنی
پکڑا جو ڈھنگ، جان پہ ظالم کے آ بنی — تھی اس سناں کی نوک کہ ہیرے کی تھی کنی
اڑ کر گری زمیں پہ سناں اس نکان سے
گرتا ہے جیسے تیر شہاب آسماں سے

جھنجھلا کے چوب نیزہ کو لایا وہ فرق پر — قاسم نے ڈانڈ ڈانڈ پہ ماری بچا کے سر
دو انگلیوں میں نیزہ دشمن کو تھام کر — جھٹکا دیا کہ جھک گئی گھوڑے کی بھی کمر
نیزہ بھی اب کے ٹوٹ گیا نابکار کا
دو انگلیوں سے کام لیا ذوالفقار کا

سنبھلا وہ بے شعور یہ جھٹکا اٹھا کے جب — قبضے کی کمان کیانی بصد غضب
چلے میں تیر جوڑ چکا جب وہ بے ادب — تیوری چڑھائی قاسم نوشاہ نے بھی تب
تیر نگاہ سے وہ خطاکار ڈر گیا
کانپے یہ دونوں ہاتھ کہ چلہ اتر گیا

بولا یہ مسکرا کے جگر گوشۂ حسن — رخ پھیر یو نہ، او ستم ایجاد و بد چلن!
چلائے بڑھ کے حضرت عباس صف شکن — کیا خوب تجھ کو یاد ہیں تیر افگنی کے فن
دیکھا ہمارے شیر کی چتون کو شان کو
کیوں منھ اتر گیا ہاتھ میں لے کے کمان کو

دو سمت سے چلے جو ملامت کے اس پہ تیر   چلّایا تیغ تیز علم کرکے وہ شریر
"ہاں اے حسین کے طفلِ بدختاں، بڑھ اِدھر!   نکلی چمک کے یاں سے بھی شمشیرِ بے نظیر
چمکا کے تیغ تیز جو قاسم سنبھل گئے
سمجھا جو کچھ، فرس کے بھی تیور بدل گئے

مانندِ شیر غیظ میں آیا وہ پیل تن   آنکھیں اُبل پڑیں، صفتِ آہوئے ختن
ماری زمیں پہ ٹاپ، کہ لرزا تمام بن   چلّائے سب کہ "گھوڑے پہ بھی ہو چڑھا ہے رن"
سیخیں زمیں کی اس کی تکاپو سے ہل گئیں
دونوں کنوتیاں بھی کھڑی ہو کے مل گئیں

دونوں طرف سے چلنے لگے وار یک بیک   دو بجلیاں دکھانے لگیں ایک جا چمک
تکنے لگے فلک کے دریچوں سے سب ملک   اِک زلزلہ تھا اوجِ ثریا سے تا سمک
چھپ کر یہ آفتاب کے مقتل کی گرد تھی
یہ خوف تھا کہ دھوپ کی رنگت بھی زرد تھی

ہر بار جانبین سے ہوتے تھے وارِ رد   تھا جس پہ ضرب، ہاں وہ شقی بھی بلا کا بد
جب بڑھ کے وار کرتا تھا وہ بانیِ حسد   کہتا تھا بازوئے شہِ دیں "یا علی مدد"
یوں روکتے تھے ڈھال پہ تیغِ جہول کو
جس طرح روک لے کوئی تنہ زور بھول کو

لایا جو حرفِ سخت زباں پر وہ بدخصال   جھپٹا مثالِ شیرِ درندہ حسن کا لال!
گھوڑے سے بس ملا دیا گھوڑا بصد جلال   اتنے بڑھے کہ لڑ گئی اس کی سپر سے ڈھال
ادھر لگی کہ ہوش اُڑے خود پسند کے
گھوڑے نے پاؤں رکھ دیے سر پر سمند کے

عباسِ نامور نے یہ پیچھے سے دی صدا   ہاں! اے جان دیکھو، احسنت، مرحبا
دشمن کے مار ڈالنے کی بس یہی ہے جا   سنتے ہی یہ، فرس کو فرس سے کیا جدا!
گھوڑا بھی اس طرف کو ادھر ہو کے پھر پڑا
مارا کمر کا ہاتھ کہ دو ہو کے گر پڑا

غازی نے دی صدا کہ "مبارک تمھیں ظفر" تسلیم کی چچا کو ادب سے جھکا کے سر
اور عرض کی یہ دور سے ہاتھوں کو جوڑ کر اقبال آپ کا، کہ ہم ہو گئی یہ سر

پشتی پہ آپ جب ہوں، تو پھر کیا ہراس ہو
کام آئے کیوں نہ درس، جو استاد پاس ہو

واجد علی شاہ

(۱۸) گو تاجدار مرثیہ میر انیسؔ کے کلام سے نمونہ پیش کرنے کے بعد کسی اور کے کلام سے اسی موضوع پر مثال پیش کرنا ایک طرح سوءِ ادب ہے، لیکن فن اور تفنن کے فرق کو ظاہر کرنے کے لئے آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ "اختر" کے مرثیہ سے جناب قاسم ابن حسن اور ازرق کی جنگ کا مرقع پیش ہے۔ شاہ مرحوم کے مرثیہ کا مطلع ہے "اے قاسم رزق دو جہاں، ایزد نشاں!" موقع وہ ہے کہ حضرت قاسم میدان میں آکر مبارز طلبی فرماتے ہیں، ازرق لڑنے آتا ہے اس کا سراپا خاص طور سے ملاحظہ ہو۔

یہ کہہ کے جو تیغ شرر آسا کو گھسیٹا ذی روح ہر اک ڈر سے ہوا گور کا مردہ!
روباہ نمط شیر سے ہر ایک حیبری تھا ازرق کو ہوا حوصلہ صمصام کشی کا

بدکار تہمتن تھا جو ادبار کی صورت
پیش نظر گل وہ چلا، خار کی صورت

بل ناصیہ پر، ہونٹوں پہ کف، آنکھوں میں اندھیر چار آئینہ میں صورت بد دیکھتا تھا شیر
جکڑا ہوا آہن میں، جھلم خود کا اک ڈھیر اور گرز سر گاؤں لئے، زندگی سے سیر

ڈھال ایک طرف نامۂ اعمال کے مانند
پوشیدہ زرہ میں ہمہ تن جال کے مانند

بدمستیاں کرتا ہوا آیا جو وہ خنزیر یاں رُوئے سر تیغ تھا اور فاطمہؑ کا شیر
ہوتی رہی اک رد و بدل دونوں میں تادیر ترکش سے تہمتن کے زمیں پر گرا اک تیر

"یہ ہوش ہے"؟ فرمایا جو یہ ابن حسنؑ نے
دکھلایا چپ و راست اسے شیر فگن نے

ماہر تھا جو غازی صفتِ جنگ و غزا میں — اس ضرب سے دل ہل گیا، جاں آئی بلا میں
روئے ملک الموت کو پایا تھا قضا میں — سر دھڑ سے الگ جھول گیا بندِ قبا میں
چار آئینہ مٹی میں ملا خاک بدن پر
اُلٹو ہوا تلوار کا ناپاک بدن پر

بگڑی کبھی قاسم خوشش خلق نے تن کر — اور لشکروں میں بانگ اذاں ہو گئی یکسر
بجنے لگے نقارے دف و نائے بتان سر — یاں سورۂ رحمٰن، خلفِ ساقیٔ کوثر
بجلی تھا لگا کو ندنے رہوار زمین پر
ہاتھوں سے لگی چھوٹنے تلوار زمین پر

آرزو لکھنوی

(۵) میر انیس کے مرثیوں سے بیشتر کی بنا لیں تو اکثر حضرات کی نظروں سے گزری ہوں گی۔ لیکن تو ان مرثیوں سے مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں جو اکثر نے نہ دیکھے ہوں گے۔ چنانچہ ایک مثال حضرت آرزو لکھنوی کے ایک مرثیہ سے ملاحظہ ہو:-

جناب آرزو ایک بیل تن سے امام حسین کی جنگ بیان فرماتے ہیں۔ موقع وہ ہے کہ جب حضرت سید الشہداء اپنے شیرانہ حملہ سے لشکر یزیدی کو تہ و بالا کر کے دم لینے کے لئے رک گئے ہیں:-

زور دکھلا کے رکا تھا جو شکستہ بازو — دوش پر تیغ تھی قبضہ سے ٹپکتا تھا لہو
سامنے آتا تھا ڈر سے نہ کوئی عربدہ جو — پسر سعد لعیں چیخ رہا تھا ہر سو!
کعبہ ڈھاتے تھے جو، اس وقت وہ اکڑ ہیں کہاں
ہمسری کا جنھیں دعویٰ تھا، وہ خود سر ہیں کہاں

سن کے یہ آ ہی گیا جوش میں اک سرہنگ — طیش کھاتا عقبِ فوج سے نکلا بہر جنگ
بولا ہمراہی لشکر ہے مرے واسطے ننگ — تن تنہا ہے اکیلے نہیں لڑنے میں درنگ
میں ہوں پشتی پر، تو جی کو نہ عبث بھاری کر
سر شہ لاتا ہوں، جا جشن کی تیاری کر

دل میں بے خوف خدا سے بھی، جفا کار ایسا
جس کا شیطان مقلد ہو، بد اطوار ایسا
نہ سمائے دہن گور میں، تیاگ ایسا
عار دوزخ کو بھی ہو جس سے گنہگار ایسا
آتشِ کینۂ اولادِ پیمبر دل میں
اک جہنم لیے پھرتا تھا ستمگر دل میں

متوجہ ہوا ظالم جو سوئے دشت اک بار
صورتِ گرگ چلا خاک اڑاتا ہوا رہوار
خود بھی تھا مرکبِ وحشی کی طرح تیز رفتار
بڑھ وہ یونہی کو کسی طرح بکا تھی تھا غبار
تند آندھی میں سیاہی سی چھپی جاتی تھی
اک بلا گرد میں پوشیدہ چلی آتی تھی

تو گرد سے ظاہر ہوئی جو، وہ گمراہ
پشت مرکب پہ سنبھل بیٹھے امام ذی جاہ
ہو کے مشتاق وغا جم گئی پھر آ کے سپاہ
ہاتھ قبضوں کی طرف بڑھ گئے اٹھنے لگی نگاہ
ہوئی لڑ جانے میں ڈھالوں کے دیر اک دم کی
ابر ٹکرا کے گرجنے لگے بجلی چمکی!

طیش میں کھاتا تھا افعی کی طرح پیچ و بل
گھات چلتی تھی، نہ کام آتا تھا کچھ مکر و دغل
دعویٰ تیغ زنی پیش امام اکمل
بھوں میں ڈھال کے الجھا دیا تلوار کا پھل
ایک جھٹکے میں جھکا وہ جو سر افلاک تھا
ہاتھ میں قبضۂ شمشیر تھا، پھل خاک پہ تھا

پھینک کر تیغ کے قبضے کو سنبھالا بھالا
بند وہ باندھا جو مدت سے تھا دیکھا بھالا
آپ ہشیار تھے، تھا وار جو ہونے والا
تیغ نے سامنے آتے ہی بلا کو، ٹالا
صورت "لا" ہوئی دو ہو کے نظر میں پیدا
نفی کی شکل تھی، اثبات ہنر میں پیدا

تیر کی زد جو نہ تھی ہو گئی بے کار کماں
تول کر دست تعدی میں بڑھا گرز گراں
سام کی گور سے آنے لگی آواز اماں
ہر من ہو گئے دہشت سے پہاڑوں میں نہاں
غل تھا اب گھات نئی صاحب شمشیر کے ساتھ
گاؤ زوری کو جھیلا، پیل دماں شیر کے ساتھ

تن کے ظالم نے دو دستی جو کیا گرز کا وار
دے کے خالی گئے پہلو پہ امامِ ابرار
ضرب کے جھونک میں آگے کو جھکا وہ غدار
چیخ اٹھا ٹیک کے گھٹنوں کو زمیں پہ رہوار

خاک اڑی ہل گیا ہیبت سے بیابان بلا
پھٹ پڑا کوہ، لرزنے لگا میدان بلا!

تول کر تیغ پکارے یہ امامِ دوسرا
آ گئی سر پہ اجل، دیکھ ادھر ہوش میں آ!
چاہتا تھا وہ سنبھلنا کہ چلی تیغ قضا
زور میں فرقِ ستمگر کٹی ہاتھ اڑ کے، گرا

قہرِ حق سے بھی کہیں امن کی جا ملتی ہے
سر اٹھانے کی اسی طرح سزا ملتی ہے

~~~~~

سنئے جناب ذکی
عون و محمدؑ کی جنگ

(الف) آپ اکیلوں کی جنگ تو دیکھ چکے۔ اب میر مونس کے پوتے ذکی سے جناب زینب کے دو صاحبزادے عونؑ و محمدؑ کی ایک ساتھ فوجِ اعدا سے جنگ کی مرقع کشی ملاحظہ ہو۔

غضب میں گھوڑوں پہ چھوٹے بھی یہ ضیغمِ نر
جو شکل دیو تھے کچھ ان پر ڈالی تند نظر
بڑھے یہ آگے تو ہٹنے لگا ادھر لشکر
نکالیں تیغیں تو سینوں میں تھرائے جگر

علی کی طرح سوئے فوجِ اہلِ شر دیکھا
زمین میں گاڑ کے نیزے ادھر ادھر دیکھا

سمٹ کے آ گیا سب شام و روم کا لشکر
جری دکھانے لگے شان و شوکتِ حیدر
محمدؑ ایک طرف آئے کھینچ تیغِ دوسر
گئے وہ دوسری جانب دکھانے اپنے ہنر

یہ کہتے تھے کہ سواروں کو تا کمر کاٹیں
وہ کہتے تھے کہ پیادوں کے پہلے سر کاٹیں

کہا یہ چھوٹے نے "ہم گھیر کر یہ تنگ کریں
پکارے عون "علم چھین لیں تو جنگ کریں
کہا یہ بڑھ کے محمدؑ نے کیوں درنگ کریں
فرس بڑھائیں، زمیں خون سے لالہ رنگ کریں

سیاہ شام سے تیغیں بھی یک قلم چھینیں
شکست فوج کو دے لیں تو پھر علم چھینیں
~~~~~

یہ سن کے فوج سے بڑھ آئے آگے کچھ اشرار | شروع جنگ ہوئی آئے تیر کیں دوچار
یہ رنگ فوجِ محمدؐ نے دیکھا جب یک بار | صدا یہ دی کہ وہ بس بھائی چھیڑ کے رہوار
اٹھائیے تیغ و سپر دیکھیے شریر آئے
اب انتظار ہے کیا اس طرف سے تیر آئے

یہ سن کے عون نے جولاں کیا فرس یکبار | ادھر بھی چھیڑا محمدؐ نے غیظ میں رہوار
فرس پہ جھومے وہ مانند حیدرِ کرار | کبھی تنے یہ ادھر مثلِ جعفرِ طیار
بلند ہاتھوں میں تیغیں تھیں ضربتوں کے لئے
جھکے ہوئے تھے ملک بھی زیارتوں کے لئے

چلے جو چھوٹی سی تیغوں کے وار لشکر پر | کہیں یہ فرق تھے بے تن کہیں تن بے سر
تڑپ رہے تھے کہیں زخم کھا کے بانیٔ شر | کوئی شریر کہیں تھا دو نیم تا بہ کمر
علی کا زور وہ اسوار کو دکھاتے تھے
فرس پہ ہاتھ یہ جو رنگ کا لگاتے تھے

بڑے نے فوج کو ریلا، اڑائے چھوٹے نے سر | وہ تیغیں توڑ کے پلٹے، یہ کاٹ آئے سر
وہ گرز لائے کسی کا، تو یہ کسی کا تبر | وہ زور دکھاتے تھے واں، یہ اپنا ہنر
وہ پہلوانوں پہ ہنس ہنس کے وار کرتے تھے
یہ اپنے کشتوں کا بڑھ کر شمار کرتے تھے

وہ اپنا نیمچہ چمکاتے تھے، بڑھا کے قدم | یہ اپنی تیغ کا دکھلاتے تھے کبھی چم و خم
وہ سر اڑاتے تھے جس کا میان فوجِ ستم | صدا یہ دیتے تھے جو رنگ اسکو کرتے ہیں ہم
کبھی وہ رکتے تھے، یہ گیر و دار کرتے تھے
کبھی یہ لیتے تھے دم، ادھر وہ وار کرتے تھے

سروں کی ہوتی تھی میداں میں ہر طرف بوچھار | بڑا نہ دیتا تھا مہلت، نہ چھوٹے کی تلوار
ذرا نہ کرتے تھے فوجوں کا خوف وہ جرار | وہ جنگ کی، کہ ہوئے رن میں کشتوں کے انبار
شمار کرنے میں لاکھوں کا وہ بھی بھول گئی
پکارتی تھی اجل میری سانس پھول گئی

ہنر دکھاتے تھے ہمشیر شاہ کے پیارے لرز رہے تھے سپاہی سپاہ کے سارے
وغا کی ہمتیں جیتے تھے جو، وہ تھے ہارے تنوں سے خون نکلتا تھا خوف کے مارے
جو نکلا دم بھی تو بس کھو کے آبرو نکلا
چھپا زمیں میں، اگر جسم سے لہو نکلا

بڑی ہوئی تھی دلیروں سے فوج میں ہلچل اٹھا کے تیغیں بڑھے آگے دو سپاہ سے یل
طویل قد، ستم ایجاد، کینہ ور، مہمل برنگ مار سیہ دونوں کھاتے جاتے تھے بل
فلک سے نعروں کی آواز جا کے ملنے لگی
پڑے جو گھوڑوں پہ لنگر، زمین ہلنے لگی

ستم شعار، جفا جو، ذلیل و خانہ خراب وہ سرخ دونوں کی آنکھیں، ذرا نہ جن میں حجاب
کمانیں قوس اجل، تیر مثل تیر شہاب پڑی ہوئی وہ سر اک رخ پہ ذلتوں کی نقاب
وہ نیزے دیو بھی آگے سے جن کے ہٹ جائے
وہ تیغ ہاتھوں میں، جن سے پہاڑ کٹ جائے

غضب میں تیوریاں بدلے ہوئے وہ بانیٔ شر کمانیں دوش پہ لٹکائے کھینچے تیغ دو سر
وہ راہوار اٹھائیں جو فیل کا لنگر قریب شیروں کے آئے شقی لڑائے نظر
خبر شکست کی فتح و ظفر سے ملنے لگی
تنے جو جھوم کے رن کی زمین ہلنے لگی

پکارے غیظ میں بچوں سے دونوں بانیٔ شر وہ نیزے اپنے ہیں، کرتے ہیں کوہ میں جو گزر
جو چار ہاتھ ہلا کر کبھی دکھائے ہنر تو بیس کوس پہ شیروں کے تھرتھرائے جگر
اماں دلیروں کو کیا وقت جنگ دیتے ہیں!
انی سے دیو کا دل بڑھ کے چھید لیتے ہیں

ہلا کے نیزوں کو آگے بڑھے وہ شقی ادھر بھی شیروں نے کہنی تک آستیں الٹی
اٹھا کے نیمچہ آئے قریب عون جری صدا دی جھوم کے چھوٹے نے "یا علی ولی!"
دلوں میں ذکر امام انام ہونے لگا
وغا کا دونوں طرف انتظام ہونے لگا

کیے شریروں نے نیزوں پہ بڑھ کے نیزوں کے وار — ادھر نہ آنکھ بھی جھپکائی دونوں نے اک بار
بڑھا کے چند قدم اپنا عون نے رہوار — بہ زور ڈانڈ کو نیزے کی تھاما آخر کار

بڑے نے چھین کے اس کا علم کیا نیزہ
تو بڑھ کے چھوٹے نے اس کا قلم کیا نیزہ

اِدھر یہ عون سے کرتا تھا مشق خود سر — بڑھا وہ چھوٹے پہ تلوار لے کے بانی شر
یہ نیزہ تانے تھے، مانند حیدر صفدر — ہوئے وہ جنگ پہ تیار صورت ضیغم

یہ نیزہ بازیوں کے سب ہنر دکھانے لگے
وہ اپنی تیغ کی برش کو آزمانے لگے

کبھی یہ اس پہ لگاتے تھے بڑھ کے نیزے کا وار — کبھی وہ غیظ میں بڑھتے تھے تول کر تلوار
یہ چوٹ کھا کے سہتا تھا، گہ ادھر غدار — کبھی وہ دست تاسف کو ملتا تھا ہر بار

یہ ضرب عون دلاور سے گہہ دبکنے لگا
چمک سے تیغ کی آنکھوں کو وہ جھپکنے لگا

بڑھا کے رخش کو مارا جو عون نے نیزا — کیا بلند تو لٹکا ہوا تھا اہل جفا
یہ حال بڑھ کے محمد نے جب ادھر دیکھا — جری نے بھائی کو دی آستیں الٹ کے صدا

"نہیں ہے دیر ذرا دونوں ساتھ مرتے ہیں
ہم اس کو دیکھیے بھائی دو نیم کرتے ہیں"

یہ کہہ کے رخش پہ دو بار جھوما وہ جرار — قدم بڑھا کے کیا بے حیا پہ تیغ کا وار
دبا کے ہاتھ کو کھینچا جو تیر نے یک بار — دو نیم ہو کے گرا خاک پر وہ ظلم شعار

نظر لڑائے تھے یاں نیزہ باز نیزے پر
یہ دیکھتا تھا نشیب و فراز نیزے پر

ابھی تو دیتے تھے جھڑکی لعیں کو عون جری — تمام فوج میں واں بھاگنے کی دھوم ہوئی
گرا جو خاک پہ وہ دشمن خدا و علی — پکاری موت، یہ گردش ترے نصیب کی تھی

جگر پہ گزری ہے کیا، منھ سے بول تو ظالم
کھڑی ہوں سر پہ میں آنکھوں کو کھول تو ظالم

طبیعتیں تھیں ابھی دونوں بشر کی برہم ملا کے دونوں نے رہواروں کو بڑھائے قدم
اٹھائے تیغے پہنچے قریب فوج ستم کسی کی تیغ لی۔ چھینا کسی سے بڑھ کے علم
کسی کا خون سے تن لال کر دیا بڑھ کے
کسی کی لاش کو پامال کر دیا بڑھ کے

پکارے عون جری، مری جاں بڑھے جاؤ فرس بھگا رہے ہیں پہلوان، بڑھے جاؤ!
نہ ان میں ایک بھی پائے اماں، بڑھے جاؤ فرس تھمے، نہ رکے ہاتھ، ہاں، بڑھے جاؤ!
جہاں رکیں یہ وہیں، ان کو مارنا بھائی!
علی کے پتیر ہو، ہمت نہ ہارنا بھائی!

یہ کہہ کے تیز کئے راہوار دونوں نے بھگائی فوج ضلالت شعار دونوں نے
نکالا تھا جو نہ دل کا بخار دونوں نے رکا جو ایک، تو کر دیا چار دونوں نے
غضب کے ہاتھ لگاتے چلے گئے سب کو!
اسی طرح سے بھگاتے چلے گئے سب کو!

شاد عظیم آبادی

(ج) اب شاد عظیم آبادی سے شامی پہلوان طارق اور امام حسین کے فرزند دلبند، شبیہ رسول، علی اکبر کی جنگ کا حال سنئے۔ وقت وہ ہے جب کہ علی اکبر کے حملہ ہائے حیدری سے لشکر یزیدی میں ابتری پھیل چکی ہے۔

ٹھہرے ہیں دور جا کے جواں بیں کے کچھ شریر چھوٹے ہیں دم، نہ یاد ہیں نیزے، نہ ان کو تیر
ڈر سے کسی طرف تھا ابن سعد گوشہ گیر کی عرض اس سے شمر نے بڑھ کر کہ اے امیر
منھ دیکھتا ہے دیر سے اب تو مدد کرے
طارق کو بھیج دے کہ اس آفت کو رد کرے

طارق نے یہ کلام جو بد کیش سے سنا کی عرض بھیج دے مجھے تابع ہوں، عذر کیا!
یہ کہہ کے جنگ پر کمر نحس کو کسا گھوڑے کو ایڑ دے کے عجب غیظ سے بڑھا
قوت ہوئی یہ دیکھ کے ہر سو سپاہ کو
فوجیں سمٹ سمٹ کے بڑھیں رزمگاہ کو

کم بخت آدمی ہے کہ جنگل کی ایک بلا! سر ہے خمِ شراب سے بھی قطر میں بڑا
سرمست و بدمست و بد آئین و پُر جفا مندیل ہے کہ سر پہ لپیٹے ہے اژدھا
آہن کا خود فرق پہ خود سر جمائے ہے
عفریت اپنے سر پہ پہاڑی اٹھائے ہے

کس طنطنہ سے پشتِ فرس پر تھا خود پرست اک کرگدن سوار تھا بالائے پیل مست
جوشن بدوش و خود بہ فرق و کماں بدست نیزہ وہ جس سے سارے علم لشکر و تیغ پست
بہوت کو ذرا اثرِ عیش و غم نہ تھا
آتش فشاں پہاڑ سے شورش میں کم نہ تھا

گرجا مثالِ رعد نکل کر وہ یاوہ گو "میں وہ ہوں خاک کر دوں مسل کر پہاڑ کو
زندہ نہیں آج زمانے میں گیو گو ہوتا تو ایک وار میں کرتا اُسے بھی دو
جا کھیل ابھی زمانۂ عیش و نشاط ہے
تو اور مجھ سے جنگ، تری کیا بساط ہے!"

جب ختم کر چکا رجز اپنا وہ تند خو فرمایا "دیکھ، مجھ سے نہ کر قصدِ جنگ تو
فوجیں کھڑی ہوئی ہیں نہ کھو اپنی آبرو رہتی یہ رائیگاں نہ ہو کھولا ہوا لہو
ٹھنڈا کرے گی تیغ، جہنم جلائے گا
دنیا سے ایک وار میں دو ہو کے جائے گا

تیغ افگنی ہے کھیل، تو تیر افگنی ہے کام عیش و نشاط یہ ہے مرا، او زبونِ شام
زور آزمائیوں کا مجھ سے عبث لے رہا ہے نام بچوں سے شیرِ حق کے تکبّر کے یہ کلام
ایسا نہ ہو کہ پھٹ کے کلیجا نکل پڑے
رکھ دوں جو سر پہ ہاتھ تو بھیجا نکل پڑے

غازی کے اس کلام سے برہم ہوا شریر جوڑا کمان میں اپنی بہ تعجیل اس نے تیر
پہنچا شقی پہ اڑ کے عقابِ فلک سریر جھجکا تھا وہ لعین کہ چلی تیغِ بے نظیر
گوشے کٹے تو رنگ اُڑا پہلوان کا
مٹھی میں کٹ کے رہ گیا ٹکڑا کمان کا

یہ دیکھ کر اٹھا صفِ لشکر میں اک غریو — جھپٹا اٹھا کے گرزِ گراں سرکو فیل گیو
غل تھا چلا پہاڑ کے ٹکڑے کو لے کے دیو — قربان زورِ ابنِ امامِ جہاں خدیو
ضربت بچائی گرز کی، کچھ ہٹ کے شیر نے
پکڑی جھپٹ کے اس کی کلائی دلیر نے

پنجے سے اک ذرا جو دیا آپ نے فشار — مٹھی سے گرز چھوٹ کے کانپا وہ نابکار
آیا بلند کر کے تبر، زمیں ستم شعار — یاں تھی بہ پیشِ حضور کی شمشیر آب دار
موذی کا زور اپنی ہی ضربت میں گھٹ گیا
دستہ تبر کا دھار کی تیزی سے کٹ گیا

نیزہ پکڑ کے سامنے آیا وہ بے شعور — فرمایا "بس نکل گیا سارا ترا غرور
تیری خطا نہیں یہ ترے دل کا ہے قصور — لے تیغ میاں سے، یہ طوالت ہے کیا ضرور
پاس آ کے بھاگتا ہے، عجب بے شعور ہے
سر پر ہے موت یہ نہ سمجھنا کہ دور ہے!"

سن کر سخن یہ غیظ میں آیا وہ فتنہ گر — تلوار لی نیام سے نیزے کو پھینک کر
فرمایا آگے آ، کہ اب آیا ہے راہ پر — کیا تو، یہ تیغ کیا تری، اور کیا تری سپر
بودا ہے لا کلام اگر دل میں کد نہیں
خالی ہوا یہ وار لگانا سند نہیں؟

ناری کے آگ لگ گئی، جولاں کیا سمند — آیا جھپٹ کے تیغ کو تولے وہ خود پسند
کس غیظ سے لگائے سیہ رو نے وار چند — پہنچا مگر نہ اکبرِ غازی کو کچھ گزند
جھٹکے کئی اٹھائے تو دل کانپنے لگا
رہ رہ کے مثلِ کلب سینہ ہانپنے لگا

نتھنوں کی وہ صدا، وہ سمندوں کی تیزیاں — وہ غل، وہ رزمگاہ کی ہنگامہ خیزیاں
گھوڑوں کی جست و خیز سے وہ خاک بیزیاں — رہ رہ کے برقِ تیغ کی وہ شعلہ ریزیاں
طوفان کا زور شور تھا اس کارزار میں
دو بجلیاں چمکتی تھیں ابرِ غبار میں

چمکی وہ فرق پر تو یہ گردن سے مل گئی — بازو پہ آئی وہ تو یہ جوشن سے مل گئی
وہ یال سے تو یہ سرِ توسن سے مل گئی — وہ پاؤں سے فرس کے تو یہ تن سے مل گئی
آنکھیں لڑی ہوئی تھیں ہر اک کی لڑائی میں
دونوں سوار فرد تھے تیغ آزمائی میں

اس رد و کد کے بعد جو جھجکا وہ نابکار — پکڑا کمر کو شیر نے پنجے میں استوار
اونچا کیا جو سر سے تو تڑپا ستم شعار — آواز دی کہ او رسگِ نا اہل و جیفہ خوار!
زورِ نبیرۂ اسدِ کبریا کو دیکھ
شان اس کی کیا بلند ہے منکر خدا کو دیکھ!

پنجے سے چھوڑ کر جو لگایا کمر پہ وار — دو ہو گئے، گر کے خاک پہ تڑپا وہ ہرزہ کار
کوتل سمند پر بھی چلی تیغِ آب دار — ٹکڑے گرے پہاڑ کے میدان میں ہو کے چار
جھومے فرس پہ مار کے اس پہلوان کو
تکبیر کی صدا سے ہلایا جہان کو

(و)

ایک جوان رعنا کی جنگ کا حال تو آپ سن چکے
شاد عظیم آبادی سے ایک بوڑھے صحابی حبیب
ابن مظاہر کی تیغ زنی بھی ملاحظہ کیجیے:-

یا تو تھے سن کی درازی سے ضعیف اور زار — زرد رنگت تھی خزاں دیدہ ہوں جیسے اشجار
اب جو دسویں کو محرم کی نظر کی اک بار — رنگ کچھ اور ہوا ابھر گئے دونوں رخسار
غیرت انگیز نہ کیوں کر ہو کہانی اُن کی
پھر پلٹ آئی بڑھاپے میں جوانی اُن کی

خون کھولا تو ضعیفی میں امنڈ آیا شباب / چہرہ گلنار ہوا حد سے بڑھا غیظ و عتاب
ہاں! کہا تھا کہ ہوا رخش سبک رو بیتاب / فوج کے بیچ میں تھا ایک اضطراب میں عتاب
جس طرف کی نظرِ قہر وہ دل پھٹنے لگے
جو پرے دور تھے وہ سوئے عقب ہٹنے لگے

تن گئے بچہ کبھی، گو فوج پہ گھوڑا ڈالا / رکھ لیا رخش کے کانوں پہ چمکتا بھالا
غیظ سے سرخ وہ چہرہ کہ خجل ہو لالا / زیرِ ران اسپِ فلک مرتبہ گھر کا پالا
ہم سے ممکن نہیں اوصاف بیانی اسکی
جس کی پیری یہ ہے کیا ہو گی جوانی اسکی

کج عمامے کے وہ پیچ اور وہ جبینِ روشن / نوجوانوں کی طرح حسن میں بے ساختہ پن
سرمئی رنگ عبا ساق سے نیچے دامن / آب ہو جائیں جگر وہ غضب آگیں چتون
تسمے نعلین سے باندھے تھے جری نے کس کے
جب بڑھے پاؤں تو سر کاٹ لئے لوہن کے

دائرے کھینچ رہی تھی جو ہوا میں شمشیر / صاف ثابت تھا کہ شعلے کی ہے سر و تحریر
خط موہوم سے تھی نور کی پیدا زنجیر / اک ابھی مٹ نہ چکی تھی کہ پڑی اور لکیر
نکلیں باہر نہ پریشاں بدھی تھی پرانداز گیسوؤں کی
رکھ لیا تھا اسی حلقے میں ستم کیشوں کو

جب سپاہ اس شیرانہ حملہ کی تاب نہ لا سکی تو حبیب نے خود عمر سعد کو للکارا وہ خود تو مقابلے کے لئے نہ آیا۔ لیکن اس نے ایک یل بیل تن مقابلہ کے بھیج دیا:۔

سن کے یہ حضرت سے بے حد طیش بڑھا وہ پڑھیں / رخش نے جست جو کی ہل گئی مقتل کی زمیں
رنگ رخسار سیہ، تنگ دل و تنگ جبیں / قد نکلتا ہوا لشکر کے جوانوں سے کہیں
دل دہل جائے جو دیکھے کوئی تصویر اسکی
تھی عزازیل سے ملتی ہوئی تقدیر اس کی

سینہ ابھرا ہوا اینٹھے ہوئے بازو اس کے / حلقۂ تنگ اس کے چھپائے تھے گھنے موئے سکے
لو تلک کانوں کی کھینچ آئے تھے ابرو اس کے / اسپ برہم تھا پسینے میں یہ بد بو اس کے

رخش پر بار تھا اینٹھا ہوا پیکر اس کا
تھا کراہت سے اٹھائے ہوئے لنگر اس کا

منھ میں کف آنکھیں نکالے ہوئے تانے بھالا — ڈانڈ وہ اگلی سیہ ہاتھ وہ کالا کالا
دل قوی سینے میں جی کھول کے لڑنے والا — ٹھاٹھ بدلے ہوئے تھا کاوے پہ گھوڑا ڈالا
رخش کے تیز قدم بعد کو کھوتے جاتے
دائرے مختصر اس دور کے ہوتے جاتے

خود بر فرق، زرہ در بدن و جوشن پوش — ہاتھ بھالے کے نکلتے تھے بعید نخوت و جوش
شور تھا لشکر اعدا میں کہ "در جنگ بکوش" — تیغ تولے ہوئے یاں ابن مظاہر تھے خموش
زد سے کچھ دور تھا وہ کس سے تکلم کرتے
دیکھ کر اس کی جسامت کو تبسم کرتے

گرد اس درجہ اڑی بھر گیا میداں سارا — نہ رہا اس کو تحمل کا زیادہ یارا
خانہ محسن میں تقدیر کا تھا سیارا — آکے نزدیک ستم گار نے نیزہ مارا
برق شمشیر شرر ریز جو فی الفور گری
پھل کہیں اور گرا، ڈانڈ کہیں اور گری

کٹ گیا نیزہ تو تھرا گیا غصے سے شریر — ہاتھ میں لے کے کماں سامنے آیا بے پیر
پینترے کر کے ستم کیش نے پھینکے کئی تیر — سامنے شیر کے روباہ سے ہو کیا تدبیر
جتنے ناوک تھے نشانے سے وہ ہٹ ہٹ کے گرے
جو قریب آئے وہ تلوار سے کٹ کٹ کے گرے

پسر سعد یہ کہتا تھا کہ میں ہوں حیراں — صف شکن ایسے بھلا عالم امکاں میں کہاں
صدقے اس پیر کی شمشیر زنی پر دل و جاں — فوج میں گرچہ ہزاروں پہ ہے بھاری یہ جواں
کثرت خوں سے منھ اس کا بھرا جاتا ہے
پاؤں جمتے نہیں، گھوڑے سے گرا جاتا ہے

گھاتیں کیں لاکھ چلی تو بھی نہ کوئی تدبیر — ضربتیں سب گئیں خالی تو تھکا وہ بے پیر
بھاگ جاؤں کسی صورت سے یہ کوشاں تھا شریر — ناگہاں ابن مظاہر نے علم کی شمشیر

سر جھکایا تو سپر فرق پہ وہ لانے لگا
پھیر کر باگ کو خود اپنی طرف آنے لگا

جب کمر شیر نے تاکی تو رُکا وہ خودسر
کھینچ لی سوئے عقب باگ کہ بچ جائے کمر
تیغ چھائی ہوئی تھی ابن مظاہر کی مگر
آنکھیں جھپکی تھیں کہ لہرانے لگی اب سر پر
دام فولاد میں جکڑا ہوا مردک گو تھا
ہاتھ تن کر جو لگایا مع مرکب دو تھا

وہ لوگ جو ان معرکوں میں اعزا و اصحاب حسین کی دست بدست لڑائیوں میں کامیابی کو مبالغہ سمجھتے ہیں وہ بہتر ہوگا کتب تواریخ کا مطالعہ کریں۔ کوئی بھی ان ممتاز تیغ آزماؤں میں سے دست بدست جنگ میں کامیاب نہیں رہا۔
سینکڑوں نے گھیر کر ان شیروں کو مارا۔ تنہا مقابلے میں کوئی ان سے جیت نہ سکا۔
اس لئے مرثیہ گو نے مبالغہ نہیں کیا ہے۔ بلکہ حقیقت واقعہ کو شاعرانہ ڈھنگ سے بیان کیا ہے۔

میر وحید وہ لوگ جو مرثیہ کے رزمیہ حصوں کو ہلکا سمجھتے ہیں اور وہ حضرات بھی جو اس صنف سخن کو واقعہ کربلا کے بیان تک محدود جانتے ہیں۔ وہ میر وحید اور ان کے بعد والے مرثیہ گویوں سے غزوۂ خیبر کی داستان سنیں اور اس کا اعتراف فرمائیں کہ انھوں نے اردو مرثیہ کے میدان میں کتنی سرسری نظر ڈالی ہے حق یہ ہے کہ اس کی وسعتوں کی پیمائش کے لئے ایک عمر چاہیئے۔ اور اس کے مطالعے کے لیے اسلامی کتب سیر سے عمیق واقفیت

اسلامی غزوات میں غزوۂ خیبر حد درجہ ممتاز و مشہور رہے۔ یہودیوں کی لوٹ مار غارت گری اور بدعہدی کا سدّ باب کرنے کے لئے حضور رسول مقبول نے خیبر ان کے مشہور حصار پر چڑھائی کی۔ یہودی قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہے۔ ان کو اپنے اس قلعہ کے استحکام کا بجا طور پر ناز تھا۔ کوئی مخالف اس وقت تک اسے فتح نہ کر سکا تھا۔۔۔
یہ قلعہ حضرت علیؑ نے کیوں کر فتح کیا۔ اس کا حال میر وحید نے اپنے مرثیے "دو ہالے قلم بہار دکھا کارزار کی" میں جس حسن و خوبی سے پیش کیا ہو وہ بے مثل و بے نظیر ہے

یہاں اس غزوہ سے متعلق انھیں کے مرثیہ پر اکتفا نہیں کی گئی ہے بلکہ تین منظر تین مرثیہ گویوں کے کلام سے پیش ہیں۔ سب سے پہلے قلعہ کا استحکام اور فوج اسلام کی اس کی وجہ سے ابتدا میں ناکامی سیر دحید سے سنیئے۔ انھیں کے قلم سے حضرت علی اور حارث جنگ کا مرقع بھی ملاحظہ کیجئے۔ پھر مہاراجہ محمود آباد محب کے مرثیہ میں حیدر کرار غیر فرار کی مرحب سردار قلعہ سے لڑائی کا حال ملاحظہ کیجئے اور قتل مرحب کے بعد فوج اسلام کا قلعہ میں داخلہ کی کیفیت خبیر لکھنوی کے مرثیہ میں پڑھیئے۔ واقعات کے بیان میں کسی طرح کے مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ کتب سیر میں یونہی درج ہے۔ البتہ مرثیے نظم میں ہیں اور تاریخیں نثر میں لکھی گئی ہیں۔

(۱) قلعہ کا استحکام اور مسلمانوں کی ناکامی۔

حصن حصین تھا سر بہ فلک مثل کوہ قاف آواز دیوزاد کی پہنچے جہاں نہ صاف
تیر نظر بھی عجز کا کرتے تھے اعتراف یعنی اہم یہ حیلہ کشی ہے خطا معاف
شہباز نصف راہ سے باز آ کے پھر پڑے
گر مرغ وہم اڑنے بھی تو شل ہو کے گر پڑے

تھا افراط ارتفاع تاریک قلعہ سب تا نصف روز رہتی تھی ہر روز اس میں شب
آتا تھا مہر پاس خط استوا کے جب کہتے تھے اہل قلعہ کہ وقت سحر ہے اب
اللہ رے اوج کاخ ضلالت مآب کا
ہوتا تھا دوپہر میں گزر آفتاب کا

تھا کوہ آہنی سے گراں تر وہ حصار فولاد کے کواڑ، جلا دار، آب دار
وسعت بھی اس قدر تھی کہ ہنگام کارزار باہر ہزار شخص نکل آئیں ایک بار
رستم کے دل کو تاب نہ واں تک گزر کی تھی
پیچیدہ اژدہا تھا کہ زنجیر در کی تھی

جب مل کے زور کرتے تھے چالیس پہلوان کھلتا تھا جز دحیدر سے تب وہ در گراں
ہوتا تھا شور کھلنے میں اسکے جو ہر زماں وجہ قوی جو اس کی ہے وہ صاف ہی عیاں

گردش میں بیقرار جو ہوتی تھیں بار سے
جو لیں پناہ مانگتی تھیں کردگار سے

تھا اس حصارِ شوم میں وہ لشکرِ گراں — یکتائے روزگار تھا اس میں ہر اک جواں
عفریت زور، پیلتن ایک ایک پہلواں — شکلیں مہیب، قد و قامت کہ الاماں
رستم نہ روک سکتا تھا ان کی حسام کو
اطفال جانتے تھے نریمان و سام کو

دیکھا قریبِ لشکرِ دیں کو جو ایک بار — کفار در کو کھول کے نکلے کئی ہزار
تلواریں دو طرف کو غضب کھینچیں بہرِ کارزار — ہر سو "بدہ، بگیر و بزن!" کی ہوئی پکار
لایعنی واں سخن تھے ہر اک بدخصال کے
نعرے ادھر سے ہوتے تھے "یا ذوالجلال" کے

تیغیں برس رہی تھیں کہ اللہ کی پناہ — دریا لہو کے بہتے تھے ما بین رزمگاہ
لاشوں کے ڈھیر روکے ہوئے تھے اماں کی راہ — راہِ خدا کی جنگ ہے احمد کے خیرخواہ
گاڑے تھے پاؤں تیغوں سے منھ موڑتے نہ تھے
ثابت قدم یہ تھے کہ جگہ چھوڑتے نہ تھے

زیرِ حصار قہر کی تھی کافروں سے جنگ — نازل تھی بامِ قلعہ سے آفت یہ بے درنگ
آتے تھے مثلِ فوج ملخ پے بہ پے خدنگ — پڑتے تھے سینہ کیطرح اس دم کلوخ سنگ
ساماں یہ تھے جو لشکرِ اہلِ عناد میں
کام آ گئے تمام مجاہد جہاد میں

گزرا جو حادثہ یہی لشکر پہ چند بار — غم سے ہوئے محمدؐ ذی جاہ بیقرار
اٹھے جو ہاتھ بہرِ دعا پیشِ کردگار — آئی صدائے شہپرِ جبرئیلؑ نامدار
مغموم دل گرفتہ جو پایا جناب کو
مژدہ دیا یہ پہنچ کے رسالت مآب کو

کی عرض اے پیمبرِ ذی جاہ و محترم — ہے یہ پیام جانبِ حق سے بصد کرم
خیبر کے باب میں نہ کرو فکر دمبدم — بازو بلا ہے تم کو ید اللہ ذی حشم

جرأت میں ذو رضرب میں یکتائے عصر ہے
فتح حصار حیدرِ صفدر پہ حصر ہے

یہ پیغام ربانی پاتے ہی حضرت علیؑ بلائے گئے۔ امام رمدِ چشم میں مبتلا تھے۔ اسی حالت مرض میں اپنے آقا کی طلب پر لبیک کہتے حاضر خدمت ہوئے۔ رسول مقبول نے معجز نمائی کی۔ لعاب دہن لگا کر آنکھیں اچھی کر دیں اور "کرار غیر فرار" کے لقب سے سرفراز فرما کر رایت اسلام عطا فرمایا۔ اور فتح خیبر پر مامور کیا۔

حضرت علیؑ تن تنہا قلعہ کی جانب بڑھے۔ حاکم قلعہ مرحب مع لشکر کے مقابلہ کے لئے نکل آیا۔ اس کے ساتھ اس زمانہ کا بڑا نامی پہلوان حارث بھی تھا۔ اس نے فوج کو روک کر حضرت علیؑ کا مقابلہ کیا۔ اس لڑائی کا حال وحید سے سنیئے۔

سایہ کی طرح ساتھ تھا حارث سا پہلوان بھی   جنات جس کے خوف سے ہوں قاف میں نہاں
سرہنگ و خیل پیکر و بدمست و بد زباں   آواز تھی کہ رعد کرے شور الاماں
چار آئینہ میں جسم زباں پر غرو تھا
فولاد کے حصار میں محصور دیو تھا

مرحب کے حکم سے وہ چلا بہر کارزار   بڑھ کر کیا مقابلہ شاہ نامدار
نعرہ کیا کہ آج میں ہوں فخر روزگار   اے نوجوان صفدر و جرار، ہوشیار!
ٹکڑے کرے پہاڑ کو میری وہ سیف ہے
حسن، یہ شباب ترا، جائے حیف ہے!

فرمایا ہنس کے وار تو کر کوئی او مخیل   کوتاہ تو ہے عقل کا، قد گرچہ ہے طویل
او سگ! خدا کے شیر کے آگے یہ قال و قیل   تو پیل زور ہے، تو خدا ہے مرا کفیل
مقہور شر کو زیر ہی دیکھا ہے خیر سے
اصحاب فیل پست ہوئے چند طیر سے!

لہ اسی موقع سے یہ دعا منسوب ہے جسے "ناد علی" کہتے ہیں اور جو اکثر صوفیائے کرام اور مومناں خوش انجام کے ورد میں داخل ہے۔

چونکہ یہودی[1] نجومیوں نے مرحب کو بتا دیا تھا۔ کہ قلعہ خیبر کی فتح "حیدر" نامی بزرگ فرمائیں گے۔ اس لئے آپ نے دشمن کے دل میں خوف پیدا کرنے کے لئے اپنا اسم گرامی مع مختلف القابوں کے بتانا بہتر سمجھا۔ فرمایا۔

"پہچانتا نہیں مجھے او مست بے ادب
باعث ہے انقلاب جہاں کا، مرا غضب
ہے مرتضیٰ تو نام، اسد ہے مرا لقب
کہتے ہیں بوتراب بھی، دستِ خدا بھی سب
حیدر بھی، ایلیا بھی، خدا کا ولی بھی ہوں
مشہور تا بہ عرشِ معلیٰ علی بھی ہوں"

ناری کو آگ لگ گئی سن سنکے یہ بیاں
دل پھنک گیا، دہکنے لگے تن کے استخواں
گلخن شکم، زبانہ آتش بنی زباں
مثل تنور منھ سے نکلنے لگا دھواں
سوز دروں سے وہ خطبِ سوختہ بنا
رخ لال ہو گیا، وہ برافروختہ بنا

خون تن میں اوٹتا تھا حرارت سے بار بار
سوزاں رگیں تپی ہوئی، آہن کے جیسے تار
تھیں پتلیاں سیاہ، جو بد دین کی آشکار
آنکھیں ہوئی تھیں سوزِ عداوت سے داغدار
دم بھر میں داخلہ تھا وہاں اس لئیم کا
مالک نے بڑھ کے کھول دیا درِ جحیم کا

آیا قریب تر جو وہ بدمست و بدسیر
گرزِ ثقیل جوم کے تانتا بہ کر و فر
دستِ قوی کھنچا طرف پشت اس قدر
پہنچا دمِ فرس پر عمودِ گراں کا سر
ڈر تھا کہ بیانہ وار اسد ذوالجلال بھی
نامرد دست جیب میں اٹھائے تھا ڈھال بھی

نوحہ کیا کہ "سر پہ بلا آ گئی ٹالیئے
تدبیر کوئی بچنے کی اس دم نکالیئے
مہلت نہیں جو ہاتھ بھی قبضہ پر ڈالیئے
جب جائیں اس پہاڑ کا لنگر سنبھالیئے"

---

[1] بعض روایتوں میں یوں بھی ہے کہ مرحب کو خواب میں مطلع کیا گیا تھا کہ وہ "حیدر" نامی بزرگ کے ہاتھ سے مقتول ہوگا۔

خارا شکن یہ گرز یکایک جو آ رہے
سر چور ہو گئے دیو کا سینہ میں جا رہے ۱۱

لایا بزور جھوم کے جب گرز گاؤ سار — دبک کے جھک گئی کمر رخش نابکار
پہنچا اٹھا کے وار کر کے برابر جو ایک بار — پھرتی سے مڑ گئے شہ دیں جانب یسار
لنگر سے جھک گیا وہ ستمگار زین پر
غیرت سے سر عمود نے ٹیکا زمین پر

حیدر پکارے، دیکھ شقی ٹل گئی بلا — کیوں سرنگوں ہوا کہ نہیں باقی حملہ؟
ٹیکا اٹھا کے حوصلہ باقی ہے کچھ تو آ — دیکھی یہ ضرب، تیغ کے جوہر بھی کچھ دکھا
سب وار اپنے رد یونہی گمراہ دیکھنا
پھر تو بھی ایک ضرب ید اللہ دیکھنا

کاٹھی سے لی شریر نے تیغِ شرر فشاں — اژدر کے منھ سے آگ کا شعلہ ہوا عیاں
طائر ہوا کے ڈر سے ہوئے ہر طرف رواں — آواز گورِ سام سے آئی کہ الاماں
جوہر نہ آشکار تھے اس برق تاب میں
لہرا رہے تھے رفعیِ خونخوار آب میں

بڑھ بڑھ کے وار کرنے لگا جب ستم شعار — ہنس ہنس کے روکنے لگے مختارِ ذوالفقار
ناری تھا یا کہ شعلۂ جوالہ بیقرار — تھی قطبِ دیں کے پاؤں کو جنبش نہ زینہار
یوں بار بار کرتے تھے رد اس شقی کی چوٹ
جیسے پھنکیت روکتے ہیں مبتدی کی چوٹ

آئی جو سوئے فرقِ علی تیغ شعلہ ور — لی بڑھ کے روک حیدرِ صفدر نے ڈھال پر
اللہ رے زور دستِ زبردست خیرہ سر — لکھا ہے یہ کہ ایک وجب کٹ گئی سپر
گردش ہوئی جو ضیغمِ امامِ انام کو
آنکھیں دکھا کے ڈھال نے توڑا حسام کو

لو ذوالفقار میاں سے کھینچی حضور نے — جھپکایا چشمِ حارثِ بیدیں کو نور نے
دامن ادھر سمیٹ لیا کوہِ طور نے — گوشے میں چھپ کے جان بچائی غرور نے

یہ ڈر بڑھا کہ رعد کی طاقت بھی گھٹ گئی
بجلی بھی "یا علی ولی" کہہ کے ہٹ گئی

غیظ و غضب میں ہاتھ اٹھایا بہ احتشام
جھکا کے سپر کو فرق پہ رکھ کر وہ تیرہ فام
جلدی لڑ کے میان سے بولی دو دستی حسام
کافر کے سر پہ چل گئی یالِ حضرتِ امام
ٹھہری نہ خود میں، نہ زرہ میں، نہ زین میں
دو کر کے ذوالفقار در آئی زمین میں

مہاراجہ سر علی محمد خان صاحب آف محمود آباد

(ک) اب اسی معرکہ خیبر میں حضرت علیؑ کا مقابلہ مرحب، مالکِ قلعہ سے جناب محب کی زبانی سنیئے:-

جا کے جاسوسوں نے مرحب کو یہ پہنچائی خبر
کہ ہوا حارثِ نا اہل کا دنیا سے سفر
سپر انداختہ ہیں حملہ سرانِ لشکر
یہ خبر سنتے ہی ٹکڑے ہوا مرحب کا جگر
تن پہ ہتھیار لگاتا ہوا ظالم اٹھا
غیظ سے ہونٹ چباتا ہوا ظالم اٹھا

زرہ و چلتہ و دستانہ و خود و بکتر
نیزہ و ترکش و چار آئینہ و تیغ و سپر
تبر و گرز گرانبار و کمان و خنجر
تھا یہ سب جسم پہ سفاک کے بار صد خر
تیج پٹکے کا کئی مرتبہ کھولا باندھا
کس کے رومال کا خونخوار نے ڈھاٹا باندھا

یوں مسلح ہو کر جب مرحب میدان میں آیا۔ تو اس نے حضرت علی کو اپنے مقابلے میں بہت ہی کمسن پا کر بڑا طویل رجز پڑھا۔

الغرض بعد ثناء و صفتِ دینِ یہود
کہے حضرت سے مخاطب یہ بکار امرِ دود
جان اک طفل کی اب لینے میں ہے کیا نام و نمود
میرے ہم عمر تو ہیں فوج میں اکثر موجود
تم سے تو عمر سے کیا لطف بھلا جنگ کا ہے
آئیں میدان میں محمد تو مزا جنگ کا ہے

سن کے تقریر شقی آ گیا حیدر کو جلال   بڑھ کے نعرہ کیا "او گستاخ، زباں اپنی سنبھال
نام سلطانِ امم پھر تو ذرا منھ سے نکال!   تازیانوں سے گرا دوں گا ابھی کھینچ کے کھال!
موت آئی ہے تری، خوب اکڑتے ظالم!
وہ تو وہ، ان کے غلاموں سے تو لڑ لے ظالم

مجھ کو کہتے ہیں اسد شیرِ دلاور میں ہوں   قوتِ بازو و داماد پیمبر میں ہوں
سر فگن، قلعہ شکن، قاتلِ عنتر میں ہوں   جو تجھے قتل کرے گا وہی حیدر میں ہوں
وقتِ آخر ترا اے زشت عمل آ پہونچا
دیکھ ہشیار کہ پیغام اجل آ پہونچا!"

یہ سخن سنتے ہی طیش آ گیا جھنجھلا کے چلا   صفت مار سیہ غیظ سے بل کھا کے چلا
اٹھ کے شست کو ہمیشہ سے گرما کے چلا   شیر کی گھات میں روباہ سا کترا کے چلا
تیغ کھینچے ہوئے چہرے پہ سپر لائے ہوئے
دم نہ لینے کی لڑائی میں قسم کھائے ہوئے

پاس آتے ہی ستمگر نے کئے وار پہ وار   کاٹتے جاتے تھے تلوار پہ حضرت تلوار
رد ہوئیں مشق کی چوٹیں تو کشادہ رگ   کرکری ہو گئی جب کر گئی تلوار کی دھار
دوسری تیغ جفا کار بدل کر آیا
اب جو آیا تو ذرا اور سنبھل کر آیا

دے کے دھوکا کبھی مغفر کبھی سپر کو تاکا   کبھی شانہ کبھی گردن کبھی سر کو تاکا
کبھی سینے کو کبھی قلب و جگر کو تاکا   کبھی پہلو کو کبھی بند کمر کو تاکا
تیغ حیدر سے کچھ اس طرح کی تکرار ہوئی
دوسری سیف بھی مردود کی بیکار ہوئی

ہونٹ غصے میں چباتا ہے ادھر وہ بے پیر   مسکراتے ہیں ادھر بادشہ خیبر گیر
ہنس کے فرماتے ہیں مرحب سے وہ عالم کے امیر   تو کہا تھا کہ عالم میں نہیں تیرا نظیر
چوٹیں خالی گئیں اب صف شکنی بھول گیا
اس قدر جلد فن تیغ زنی بھول گیا!

منھ کی کھائی تو ہوا اور بھی ششدر وہ شغال　　شہ سے جھنجھلا کے یہ کہنے لگا روباہ خصال
اب کھلا سحر میں بھی آپ کو حاصل ہے کمال　　سن کے یہ آگیا ضرغام الٰہی کو جلال
بن گیا تیر ملامت کا نشانہ الٹا
آستیں آپ نے الٹی کہ زمانہ الٹا

شور ہے صارم تیز شہ عالی چمکی　　یا کہ رفعت صفت قطب شمالی چمکی
شکم گاؤ زمیں کاٹنے والی چمکی　　خیبر رخ پر چڑھ کے وہ شمشیر ہلالی چمکی
سپر سنگ وہ مرحب نے اٹھائی دیکھو
تیغ بجلی کی طرح سر پہ وہ آئی دیکھو

سپر و خود کو دو کرتے ہی سر تک پہونچی　　سر سے اتری تو دل بانی شر تک پہنچی
دل سے کچھ اور بڑھی تھی کہ جگر تک پہنچی　　خانۂ کفر سے الحاد کے گھر تک پہنچی
دونوں حصوں کا مساوات میں یہ عالم تھا
وہ زیادہ تھا نہ یہ بال برابر کم تھا

کر کے دو بند کمر ناف لعیں کاٹ گئی　　واں سے آگے جو بڑھے خانۂ زیں کاٹ گئی
زیں سے اتری تو گزوں سطح زمیں کاٹ گئی　　اٹھتے اٹھتے پر جبرئیل امیں کاٹ گئی
دو ہیں اسوار و فرس وار اسے کہتے ہیں
ہاتھ اسے کہتے ہیں، تلوار اسے کہتے ہیں

سرفراز حسین خبیر

بہتر ہوگا کہ یہاں سے فتح قلعہ کا ماجرا جناب خبیر سے سنئے۔ انھوں نے چہاردہ معصومین کے حال میں مرثیے الگ الگ کہے ہیں اور وہ اب سے کچھ دنوں پہلے تک دبیر اسکول کے سب سے بڑے نمائندے تھے۔ انھوں نے بھی اپنے مرثیہ "خیبر کشائے نظم ہے تیغ زباں مری" جنگ خیبر نظم کی ہے۔ قتل مرحب کے بعد واقعات یوں فرماتے ہیں:۔

کی جست اس طرف سے جو دم لے کے ایکبار　　خندق کے اس طرف تھے شہ آسماں وقار
واں جا کے پھر چمکنے لگی تیغ برق بار　　ڈر کر سپاہیوں نے لیا جادۂ فرار

ساماں امان پانے کا وہ چند کر لیا
قلعہ میں جا کے چھپنے کا در بند کر لیا

جھپٹے لبانِ شیرِ امام فلک پناہ قلعہ کے پاس ڈھال کو پھینکا بعز و جاہ
لوہے کے در میں انگلیوں نے یوں بنائی راہ داؤد کا کمال ہوا دست بوسِ شاہ
جنبش جو دی تو کام ہر اک سر بہ سر بنا
دستِ خدا کے ہاتھ میں وہ در سپر بنا

چلنے لگی حصار میں پھر تیغِ شعلہ ور بولے ملک کہ شانِ الٰہی ہے جلوہ گر
رہتی تھی یہ خزانۂ قدرت میں بیشتر محبوب ہے خدا کو یہ شمشیر کس قدر
جوہر کرامتوں کے بھرے اس کی ذات میں
حیدر کو دے کے قبضہ رکھا اپنے ہات میں!"

پایا کسی نے تیغِ برش کا نہ اور چھور برباد مورچے ہوئے پس پس کے مثلِ مور
روکے رکا نہ بازوئے حیدر اور اس کا زور آخر کو ہر طرف سے اٹھا "الاماں" کا شور
اسلام کا مہیب جو ہر دل پہ چھا گیا
شیرِ خدا کو دشمنوں پر رحم آ گیا

خندق کی سمت پلٹے تو دیکھا یہ تھنے حال آتے ہیں مصطفیٰؐ مع اصحاب خوش خصال
سب فوج کو عبور کی تشویش ہے کمال قربان زور و ہمتِ ضرغامِ ذوالجلال
پتے کو پھول پھول کو گلشن بنا لیا
در کو سپر کیا پل آہن بنا لیا

خندق کے عرض سے تھا بہت در کا طول کم تھے بیچ میں ہوا پہ معلق شہِ امم
آجاتے تھے جو تختے پر اربابِ دیں بہم اس سمت اتار دیتے تھے مولائے ذی حشم
غل تھا شرف یہ خاص ہیں حیدر کے واسطے
ایسے قدم ہوں دوشِ پیمبر کے واسطے

آئی تمام فوج جو اس سمت سے ادھر دستِ خدا نے پھینک دیا ہاتھ سے وہ در
فرمایا مصطفیٰؐ نے "مبارک ہو یہ ظفر رکھا علی نے پائے ہمایوں پہ بڑھ کے سر

شہ نے خطاب فاتح خیبر عطا کیا
حیدر نے جھک کے شکر کا سجدہ ادا کیا

فراست زیدپوری

آپ معرکۂ خیبر تو دیکھ چکے اب جنگ لیلۃ الہریر بھی ملاحظہ فرمائیے۔ جنگ صفین میں جو آخری لڑائی ہوئی وہ رات بھر جاری رہی اسی لئے اسی کا نام لیلۃ الہریر (ایسی رات جس میں کتے بھونکتے اور روتے رہیں) پڑے گا۔ جب فراست زیدپوری شاگرد مرزا اوج نے چہاردہ معصومین کے جو الگ الگ مرثیے کہے ہیں اور جن کے مجموعے کا نام "ماہ کامل" رکھا ہے ان میں سے ایک میں جو حضرت علی ابن ابی طالب کی جنگوں سے متعلق ہے۔ جنگ لیلۃ الہریر کی بھی بڑی کامیاب مرقع کشی کی ہے۔

سرگرم حرب و ضرب تھی افواج کی بھیر
پر آخری لڑائی میں گھبرا گئے شریر
رن میں تمام رات رہا شور دار و گیر
کہتے ہیں جس کو معرکۂ لیلۃ الہریر
پوشیدہ شکل راحت و آرام ہو گئی
غلے سحر سے ہونے لگے شام ہو گئی

دوش فلک سے گر گئی خورشید کی سپر
تیغیں بہادروں کی رہیں رن میں جلوہ گر
مرتے تھے بانکپن پہ جوانان پرجگر
کچھ خوف جاں نہ ظلمت شب کی طرف نظر
تلوار چل رہی تھی کنارے فرات کے
ڈھالوں پہ تھا گمان کہ ہوئے ٹکڑے رات کے

خونریز مثل چشم فسوں ساز تھی وہ شب
گیسوئے مہوشان کی طرح ڈھاتی تھی غضب
صحرائے ہولناک میں ہنگامہ تھا عجب
رن بولتا تھا ساکن دریا تھے جاں بلب
اڑتی تھی خاک مرغ ہوا بے حواس تھے
ذرّے ملبد ہو کے ستاروں کے پاس تھے

ہر سمت روشنی تھی عدو کی سپاہ میں
جلتی تھیں ماہتابیاں ابر سیاہ میں
پر اہل شام ٹھوکریں کھاتے تھے راہ میں
مشعل کوئی ٹھہرتی نہ تھی رزم گاہ میں

بادِ فنا سے بچ نہ سکیں چھپ کے گرد میں
شمعیں بھی کشتہ ہوگئیں دشتِ نبرد میں

قہرِ الٰہ تھا شبِ محشر نما کا طول — غل وحشیوں میں تھا کہ بلا کا ہوا نزول
طائر ہوائے تند کے جھونکوں سے تھے ملول — جگنو شجر سے گرتے تھے جیسے خزاں میں پھول

برباد برق خوف سے آبِ رواں ہوا
سبزے پہ تیرگی میں دھوئیں کا گماں ہوا

دنیا سیاہ کاروں کی آنکھوں میں تھی سیاہ — ظلمت میں سرمہ گوں ہوئے تھے رشتۂ نگاہ
ایسا اندھیرا گھُپ تھا کہ اللہ کی پناہ — صرصر سے حال دشت پر آشوب تھا تباہ

موجِ ہوا تھی کاہے کو مجنوں کی آہ تھی
وہ رات مثلِ گیسوئے لیلیٰ سیاہ تھی

لو آفتابِ دیں کی سواری عیاں ہوئی — جنگل میں روشنی ہوئی ظلمت نہاں ہوئی
طوفانِ غم میں غرق سپاہِ گراں ہوئی — دریائے خوں میں تیغ کی کشتی رواں ہوئی

اسپ و سوار غرقِ محیطِ فنا ہوئے
دستِ خدا کے وار سے بے دست و پا ہوئے

قبضہ میں ذوالفقار ظفر پر تھا دسترس — گھوڑا اڑا ہوا میں تو گھبرا گئے بوالہوس
نام اس کا تھا ریاح، صبا کا تھا ہم نفس — تھا مرسل الریاح کے محبوب کا فرس

قربِ علی سے زین کا رتبہ بلند تھا
یہ حبیب کے جانشین تھے اس کا سمند تھا

ڈرتا نہ تھا کہیں غضبِ تاریکیٔ تار سے — چالاک بڑھ گئے ابلقِ لیل و نہار سے
ڈوبا یمینِ فوج سے نکلا یسار سے — ساحل پہ تھا سمٹ کے اڑا جب کچھار سے

موجوں کو اپنا طرزِ روانی دکھا گیا
آبِ رواں کو جوشِ جوانی دکھا گیا

چمکی جو تیغ بڑھ کے تو سنسن بخاب — بجلی کی روشنی میں ہیلا غیرتِ سحاب
قہرِ خدا تھی ضربتِ شمشیرِ بوتراب — مٹی میں فوج مل گئی مٹی ہوئی خراب

چکر میں آئی سطحِ زمیں ذوالفقار سے
کانپا فلک اس اخترِ دنبالہ دار سے

چہرے سیاہ کاروں کے مثلِ فلق تھے فق　　حیدر کے خوفِ ضرب سے قلب و جگر تھے شق
نعروں سے زلزلے میں تھا صحرائے لق و دق　　میدان میں ڈکارتا پھرتا تھا شیرِ حق
دیتی تھی ظالموں کی اجل کا پیام رات
جھنکار تیغ کی رہی رن میں تمام رات

تلوار چلتے چلتے کٹی رات ناگہاں　　پھر چھا ہوا۔ سحر کی سفیدی ہوئی عیاں
پھولی نہ تھی شفق ابھی بالائے آسماں　　سرخی زمیں کی دیکھ کے چلائے پہلوان
ہیں سرکشوں کے خون سے جل تھل بھرے ہوئے
لاشے نہیں لہو سے ہیں بادل بھرے ہوئے

فراست زیدپوری عباسی بادشاہ متوکل نے امام علی نقیؑ کو اپنی کثرت فوج دکھا کر مرعوب کرنا چاہا وہ مدعی ہے کہ "ایسی سپاہ آپ نے دیکھی نہ ہوگی۔" حضرت نے اس کے جواب میں اُسے اپنا لشکر دکھایا ہے۔ فراست کے اس عسکرِ قہار کا حال سنئے:۔

شہ نے کہا کہ "دیکھتا ہوں تیرا کرّ و فر　　دیکھے گا میری فوج بھی، اے بے خبر؟"
بولا "کہاں ہے آپ کا لشکر کروں نظر"　　فرمایا "دیکھ جانبِ گردوں اٹھا کے سر"
گھبرا کے سمت عالمِ بالا نگاہ کی
کچھ انتہا ملی نہ عدو کو سپاہ کی

دیکھا کہ مشرق سے ہے رواں غرب تک سپاہ　　حربے وہ شعلہ ریز[1] کہ اللہ کی پناہ
ان کی ہوا لگے تو اڑیں کوہ مثلِ کاہ　　سایہ اگر پڑے لبِ دریا سے نکلے آہ

---

[1] شاعر کے تخیل نے ان آلات کا ایک دھندلا خاکہ پیش کر دیا ہے، جو تقریباً ایک صدی بعد ایجاد ہونے والے تھے۔

موجوں میں بے حیاتوں کا جمِ غفیر ہو
پانی سمٹ کے زیرِ زمیں گوشہ گیر ہو

دیتی ہو سُرخ رنگ، جو برسائیں بن میں آگ
بھر جائے ہر نشیمنِ زاغ و زغن میں آگ
اژدر جو کھولیں منھ بھڑک اٹھے دہن میں آگ
بجلی سے تڑپیں شیر لگے یوں بدن میں آگ
جل کر ہوا دھواں ہو، غبارِ آتشیں اٹھے
بیتاب ہو کے اپنی جگہ سے زمیں اٹھے

پوری نہ مدح ہو جو لکھے عمر بھر قلم
اک ضرب سرسری سے ہوں لاکھوں کے سر قلم
ہر وار میں ہوں دشت کے صد ہا شجر قلم
کوہِ گراں کے سنگ ہوں ریزہ ریزہ قلم
تیغوں سے مثل خود و سپر آسماں کٹیں
وہ برق دم کہ ابر میں کیا، بجلیاں کٹیں

گھوڑے وہ زیرِ ران ہیں کہ بیخود سوار ہیں
سب اپنے آپ کے لئے فصلِ بہار ہیں
سرعت کا ہے یہ دشت احد بیں جنکی یار ہیں
سعدین و نیّرین سموں پر نثار ہیں
ہے قدرتی بناؤ خدا ساز ساز ہے
ناز و ادا کو صورت و سیرت پہ ناز ہے

پیارے وہ جوڑ و بند وہ کج دم وہ کن بان
نازک خرام و چالک و چالاک و بے تکان
باتیں ہوا سے کرتے ہیں مشتہو بے زبان
قالب ہیں بیشمار مگر سب ہیں ایک جان
جاتے ہیں مثل نالۂ دل پاک و عیب سے
آنے میں کچھ یہ کم نہیں آوازِ غیب سے

گردن کا وہ فروغ جھکتی ہوئی وہ یال
خورشید کی کرن سے ہم آغوش ہے ہلال
جاندار ایسے ہیں کہ پھڑکتا ہے بال بال
لذت اٹھائے روحِ رواں وہ مزے کی چال
شائستہ، اپنے لشکریوں سے پلے ہوئے
اسواروں کے دلوں کی طرح سے ملے ہوئے

کیا فوجِ قاہرہ ہے وہ بے شوکت و حشم
وہ ہمہمے، وہ نعرۂ تکبیر دمبدم
دنیا کے جن و انس دہائم جو ہوں بہم
اس نور کی بھیڑ سے تعداد میں ہوں کم

ہے سلسلہ کہاں سے کہاں تک پتہ نہیں
مثل ثواب نصرتِ دیں انتہا نہیں

ہے اُن کے سامنے کسی لشکر کی اصل کیا — شور و نشور و فتنۂ محشر کی اصل کیا
طوفاں کی کیا بساط ہے صرصر کی اصل کیا — پانی کا جوش کیا ہے، سمندر کی اصل کیا
آندھی کو زلزلے کو اشارے سے روک دیں
بحرِ رواں کو تیغوں کی دھاروں سے روک دیں

روندیں صفیں گر آئیں سواروں کو نار میں — گھوڑوں سمیت پھینک دیں وار لہو اریں
صحرا سے خون بہہ کے رواں ہو کچھار میں — مجبور ہوں پہاڑ لہو کے حصار میں
اس طرح جذب خون سیاہ عدو کا ہو
کھودیں زمیں پہ چاہ تو سوتا لہو کا ہو

غش کھا کے گر پڑا متوکل زمین پر — آیا جو ہوش کہنے لگے شاہ بحر و بر
ہم فکر آخرت میں ہیں تجھ کو نہیں خبر — دنیا کی یاد ہے نہ تمنائے مال و زر
تابع منافقوں کا ہے کچھ جانتا نہیں
افسوس میرے حق کو تو پہچانتا نہیں!"

اردو مرثیہ میں انھیں عناصر کی موجودگی کی وجہ سے نواب امداد امام اثر، جعفر علی خاں اثر اور ڈاکٹر اکبر حیدری اسے رزمیہ کہنے پر مصر ہیں۔ اور چونکہ اس کے بیشتر مقامات پر گفتگو اور مکالمہ بھی آتا ہے اور اس کی خواندگی میں آواز کے اتار چڑھاو، چشم و ابرو کے اشارے، دست و بازو کی حرکتیں، غم و غصہ، علامت و نفرت، محبت و اخلاق اور مختلف طرح کے جذبات کے اظہار میں چہرے اور لہجے میں اس طرح کی تبدیلیاں مرثیہ خواں کو کرنی پڑتی ہے۔ جس طرح ایک ایکٹر کو اس کے ماہر فن تمثیل ڈاکٹر صفدر آہ اسے ڈرامے کی ایک صنف قرار دیتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے۔

"مرثیے صرف کہنے کی چیز نہیں ہیں۔ بلکہ پڑھنے، سنانے اور پیش کرنے کی چیزیں ہیں۔ جس طرح ڈرامے کے اصلی جوہر اس وقت تک نہیں کھلتے۔ جب تک اسے

---

[1] زردو کی ہند۔ مصنفہ ڈاکٹر صفدر آہ

اسٹیج پر نہ پیش کیا جائے۔ اسی طرح مرثیے کے فن کی ساری لطافتیں اور باریکیاں صرف اسی وقت ظاہر ہوتی ہیں جب اسے ممبر (اسٹیج) پر پیش کیا جاتا ہے۔ اور یہاں شاعر بہ یک وقت شاعر اور اداکار کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔" سردار جعفری بھی اس رائے سے اتفاق رکھتے ہیں۔ وہ فردوسی ہند کے دیباچے میں تحریر کرتے ہیں "اردو مرثیے کی صنف میں ایک ایسے ڈرامے کا آغاز ہوا ہے جس میں ایک اداکار بہ یک مختلف کرداروں کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور یہ فن شعر گوئی اور اداکاری میں ایک قابل قدر اضافہ ہے" ہم اس باب کی ابتدا ہی میں اپنا موقف ظاہر کر چکے ہیں۔

اردو مرثیہ نہ خالص رزمیہ ہے، نہ خالص ڈرامہ۔ یہ ایک ایسا نظمیہ ہے جو ان عناصر کی موجودگی کے باوجود ایک نئی صنف شاعری ہے۔ اور یہ اردو زبان کی طرف سے عالمی ادب میں ایک حد درجہ حسین اضافہ ہے۔ ہم اس پر جتنا بھی فخر کریں وہ کم ہے اس لیے کہ یہ ہماری چیز ہے اور صرف ہماری۔ نہ فارسی کی تقلید، نہ عربی کی ریس، نہ یونان کا عطیہ، نہ سنسکرت کا تحفہ اور نہ مشرق و مغرب کی کسی زبان کی نقل!

فارغ سیتاپوری رزمیہ اور ڈرامہ کی ایک اور مثال فارغ سیتاپوری کے اسی ناتمام مرثیے سے ملاحظہ فرمائیے، جسے ڈاکٹر آغا ادب مرثیہ کا سب سے طویل مرثیہ اور ڈرامائی رزمیہ کا ایک غیر فانی کارنامہ" قرار دیتے ہیں۔ یہ ناتمام مرثیہ ۸۲۵ بند کا ہے اور یہ فارغ کی ناوقت وفات کی وجہ سے نامکمل رہ گیا۔

موقع یہ ہے جب کہ کربلا میں خیمہ ہائے اہلبیتؑ اطہار، نہر فرات پر حضرت عباس کی نگرانی میں نصب کیے جاتے ہیں۔ عین اسی وقت فوج یزیدی اپنی ارکان کی ماتحتی میں پہنچ جاتی ہے۔ اور خیمہ ہائے امام کو نہر سے ہٹانے اور پانی سے دور، جلتی ریت پر لگانے کا حکم دیتی ہے۔ میر انیس نے اپنے ایک مشہور مرثیہ میں اس منظر کو بڑے فنکارانہ حسن سے مگر قدرے اجمال سے پیش کیا ہے۔ میر فارغ ان کے شاگرد رشید نے نے بڑی تفصیل سے کام لیا ہے اور اس میں رزم اور ڈرامہ کے مختلف پہلو خاص طور سے نمایاں کیے ہیں۔

کاموں میں کارکن تھے اِدھر اور اُدھر رواں — مثلِ اسد ٹہلتے تھے عباسِ نوجواں
کوشش تھی اب بلند ہو خیمہ کہ ناگہاں — آندھی کے سامنے سے نمایاں ہوئے نشاں
خاک اڑ کے اونچی جانے لگی کوہسار سے
نخل اس طرف کے چھپ گئے گرد و غبار سے

لشکر میں اک پکار ہوئی " لستہ ڈیں یہ آؤ — آندھی اٹھی ہے خاک سے اسباب کو بچاؤ
گھوڑوں پہ ڈال دو، ہیں کدھر؟ گرد پوش لاؤ — ڈر ہے ہوائے تند کا زیرِ شجر نہ جاؤ
مانگو دعائیں دیکے اذانیں اسی جگہ
گل کر دو آگ فوج میں ہو گر کسی جگہ

بولے اُدھر یہ حضرت عباسِ خوش خصال — تم اپنے کام پر رہو حافظ ہے ذوالجلال
اس سرزمیں پہ ہوتے ہیں برپا خیامِ آل — آندھی ہو، کچھ ہو، یاں تلک آئے یہ کیا مجال
قبضہ میں آب و آتشِ عالم تمام ہے
سب خاک و باد تابعِ حکمِ امام ہے "

ناگاہ آئی دور سے باجوں کی کچھ صدا — پیدا ہوئی سیاہیِ لشکر بھی جا بجا
تھرایا بارِ فوج سے صحرائے کربلا — گیتی کا زلزلہ ہوا محسوس زیرِ پا
ظلمت سیہ نشانوں کی آگے بڑھی ہوئی
اک رات تھی کہ آتی تھی دن پر چڑھی ہوئی

غل پڑ گیا، " یہ شام کے لشکر کے ہیں نشاں — ہاں برچھیں گرد و، پھاڑ کے ڈھالوں کے آسماں
نزدیک اب ہے تیغ زنو وقتِ امتحاں — چل کر وہیں نپٹ لو، وہ آنے نہ پائے یاں
حضرت بھی کچھ کہیں گے نہ اس شور و شر کے بعد
آقا کو معرکہ کی خبر ہو ظفر کے بعد

بڑھ کر پکارے حضرت عباسِ صف شکن — اے مرحبا! یہ جوشِ شجاعت کے ہیں سخن
تم کیوں بڑھو خود آتے ہیں زد پہ وہ بدچلن — پہنچے اِدھر سے شیر، کہ بس ہو گئے ہرن!
مردوں کے وار چلتے ہیں نامرد قوم پر
جاتے ہیں مرد بھی کبھی نامرد قوم پر

یہ ذکر تھا کہ بھر گیا میدان سپاہ سے
صحرا تمام ہو گیا پنہاں نگاہ سے
نعرے کئے جو بڑھ کے شریروں نے راہ سے
بھاگا کالرز کے امن مقام پناہ سے
در آئے فرس کہ آ گئی آفت جہان پر
اڑ کر چلا زمین کا طبق آسمان پر

فربہ وہ پہلوانوں کے اینٹھے ہوئے بدن
کہنے کو آدمی پر حقیقت میں اہرمن
جاسوس رُم بریدہ کوئی، کوئی کرگدن
ہمتن نہ جن کا تن میں، تہمتن سا پیل تن
ترکیب و وضع و صورت و ہئیت مہیب تھی
ہر قطع جس کی جو وہ عجیب و غریب تھی

داڑھی وہ تا بہ ناف وہ مونچھیں کھڑی تمام
آنکھیں کبود و زرد تو چہرے سیاہ فام
کالا تھا اور دیوں سے بھی کالائے اہل شام
مشکیں ہر اک سمند بھی بدزین و بد لگام
منحوس و شوم افسر خانہ خراب بھی
تھا بدرکاب مرکبِ ابنِ رکاب بھی

بڑھ کر یہ نعرہ زن ہوا وہ افسرِ سپاہ
فوج آ گئی اٹھاؤ یہ کس کی ہے بارگاہ
گرمی میں نہر پر ہے اترنے کی سب کو چاہ
ہٹ جاؤ جلد تا کہ نہ ہو قافلہ تباہ
لشکر ہے بس یہی تہ گردوں سریر کا؟
کدتر نہ لوٹ لے کہیں فوج امیر کا!

گھوڑوں کی اس طرف سے جو اٹھ جائیں گی عناں
ٹاپوں سے یوں پسو گے نہ رہ جائیگا نشاں
یہ عسکر کثیر کہاں، یہ سپہ کہاں
کیا لڑ سکو گے تم؟ کرتے ہو جانوں کو رائگاں
تم لوگ ہے؟ ہم یہ ہاتھ سے دریا کا گھاٹ دیں؟
اک ایک مشت خاک جو ڈالیں تو پاٹ دیں!

لشکر ابھی یہ کیا ہے کہ آئے ہیں کچھ سوار
فوجوں سے ہیں بھرے ہوئے صحرا و کوہسار
تا شام و کوفہ ایک ہے ہر شہر و ہر دیار
آئیں سمٹ کے تو نہ گیتی اٹھائے بار
ہو اس قدر رسد کی گرانی، نہ مل سکے
غلے کا ذکر کیا، کہیں پانی نہ مل سکے

ہم سب سے پہلے اس لیے آئے بصد شتاب — دریا کو تم یہ روک دیں قطرہ نہ پاؤ آب
کوثر ہے کچھ یہ نہر کہ مالک ہیں بوتراب؟ — پیاسے مریں وہ، ہے جنھیں بیعت سے اجتناب
پھر ہم کو کیا کہ بادشہِ مشرقین ہیں
ہوں لاکھ اگر نبی کے نواسے حسینؑ ہیں!"

حضرت عباسؑ کی طرف سے جواب

جھپٹے پکڑ کے تیغ کو، تو انس کی سپہر — دو لشکروں کے بیچ میں آ کر بہ کرّ و فر
للکارے یوں کہ کون ہے تو اے زبوں سیر — بڑھنا ہے گر تو بڑھ، نہیں اب آتے ہم ادھر
لازم ہے مرد کو جو کہے صف سے کر ہٹے
بس حد وہ ہے، قدم نہ ادھر سے ادھر ہٹے
جاتی ہے آبرو، نہیں تلوار کو سنبھال — اب صف پہ اڑ رہا ہے دہلوں کیوں؟ اٹھا تو ڈھال
ساحل تک آئے فوج، یہ کیا جان، کیا مجال — کر دیں زمیں پہ خون کا چہلا دمِ جدال
رسی دراز بھی ہو تو سب بل نکال دیں
بھاگڑ میں جو گرے اسے دریا میں ڈال دیں

ہوں گے خیامِ آلِ پیمبرؐ ترائی میں — اترے ہیں شیرِ بیشۂ حیدر ترائی میں
آنا ہے سہل؟ آئے تو لشکر ترائی میں — پل باندھ دیں سروں کے سراسر ترائی میں
آبِ رواں کو تیغ سے ٹھہرا دیں کاٹ کے
دیوار کر دیں نہر کو لاشوں سے پاٹ کے"
"آ جم کے دو دو ہاتھ ہوں، اے بڑھ کے ابتدا کر — سبقت تو کر، پھر آئے مزا امتحان سے
سب دیکھیں چوٹ چلتی ہے کس آن بان سے — کس کس چمک سے گرتی ہے برق آسمان سے
کھل جائے ڈر سے کتنے جھجک کر جواں گرے
پرزے سپر کے اڑ گئے، کتنے کہاں گرے
گر یہ نہیں تو ہٹ، تری جنگ و جدال کیا — یہ کیا لڑے گی ہم سے یہ فوجِ ضلال کیا

پوچھو ان کے دل سے تیغ زبوں کا ہی حال کیا | جب کھنچ گئی تو پھر ہو، نکالی، مجال کیا

ٹل جا، بچا لے جان ابھی، لڑ کر مفر نہیں
او خانہ جنگ، دیکھ یہ میدان ہے گھر نہیں

گو فوج اُدھر بہت ہے ادھر کم ہیں جانثار | پر ایسی چیونٹیوں کی قطاروں کا کیا شمار
پاؤں سے روند ڈالیں گے شیرانِ روزگار | یہ بھی خبر نہ ہوگی پسے کب ستم شعار

مرنے میں دیر کیا کہ اجل سے قریں ہیں یہ
حشر ان کا دیکھنا حشراتِ زمیں ہیں یہ

چھوٹے یہ کہہ کے غیظ میں عباسؑ نامور | تھرا گئی سپاہ، دبا وہ زبوں سیر
نکلے صفوں سے چھنٹ کے کئی سو سوار اُدھر | کہنے لگے "ہیں آپ اسد اللہ کے پسر

قائل ہیں سب حضور جری ہیں، دلیر ہیں
ہم بھی دمِ مقابلہ میدان کے شیر ہیں"

ڈرامائی مکالمے

فرمایا "پھر ہو دیکھتے کیوں صورتِ شغال؟" | بولے "بس اب بڑھے!" تو صدا دی بصد جلال
"ہٹ جاؤ اب!" یہ سن کے پکارے وہ بد خصال | "لے لیں گے ہم فرات کو!" ڈانٹا کہ "کیا مجال!"

واں غل ہوا کہ "روک لیں شیرِ عرب کو ہم"
گرجا ہژبر ادھر کہ "الٹ دیں زمیں کو ہم"

بڑھ کر کہا "گھٹا سی اب اُمڈے گی فوجِ شام" | آواز دی جری نے کہ "بجلی ہے یہ حسام!"
بھونکے وہ سگ "ترائی سے کیا آپ کو ہے کام؟" | گونجا اسد "یہ شیر دل کے رہنے کا ہے مقام!"

چنگھاڑے سب وہ دیو کہ "گھوڑا اٹھاتے ہیں"
نعرہ کیا "تم آؤ گے کیا، لو، ہم آتے ہیں!"

جنگ

یہ کہہ کے اسد جلال میں جھپٹے کہ الحذر
بولا یہ ابنِ سعد سے ابنِ رکاب بد آکے جلد تر
الجھو نہ اس اسد سے سرک جاؤ سب ادھر
میں لے کے ساری فوج کو ہوتا ہوں حملہ ور
وہ شیر ہے کہ مثل نہیں کائنات میں
تم جا کے گھوڑے ڈال دو نہرِ فرات میں

تدبیر یہ ہے ڈال جو ہیں مردانِ سرگزار
سبقت نہ تم نے کی، تو نہ وہ بھی کریں گے وار
پھر کیا رکو گے، سو سے بہت کم وہ، تم ہزار
یوں نہر لو، لڑے تو بڑی ہوگی کارزار"
سنتے ہی بس ہر اک یلِ بیداد گر بڑھا
وہ اس طرف کو بڑھ گئے لشکر ادھر بڑھا

عباسِ نامور نے یہ شیروں کو دی صدا
لینا انہیں سنبھلنے نہ پائیں یہ اشقیا
ہوتا ہے دیکھو خیمہ ابھی وہاں بپا
تر ہو نہ ان کے خونِ نجس سے کہیں وہ جا
"تلوار ماریو نہ کسی روسیاہ کو
ڈھالوں کی او جھڑوں سے بھگا دو سپاہ کو

سنتے ہی نعرہ زن ہوئے، جھپٹے دلیر ادھر
رستے ہی میں وہ تھے کہ سروں پر تھے خنجر
ڈالا کسی نے ہاتھ کسی کی لجام پر
منہ پر کسی فرس کے کسی کی پڑی سپر
چھینا کسی نے گرز کسی زورمند سے
کھینچا کسی نے بڑھ کے کسی کو سمند سے

پکڑا گلا کسی نے کسی بدشعار کا
پہونچا لیا کسی نے کسی نابکار کا
جھٹکا کسی نے ہاتھ کسی شہ سوار کا
توڑا کسی نے پاؤں کسی راہوار کا
پھینکی کسی جری نے عناں کوئی توڑ کے
پٹکا کسی نے رخش کو گردن مروڑ کے

تن کرکسی کی ابن مظاہر نے لی کماں — چھینی بلال نے کوئی شمشیر جاں ستاں
ضرغامہ واسد نے بھی ڈانٹا جو ناگہاں — کانپے فرس لرز گئے نیزے جھکے نشاں
کی بڑھ کے جنبش سعد نے ہر شخص شاتم کی
گھوڑوں کی تو تھامنے ترکی تمام کی

اکبر جو نیزہ داروں کی جانب جھپٹ کے آئے — بے خواب بند بند لعینوں کے تھرتھرائے
قاسم کے ڈر سے تیغ زنوں نے بھی منہ چرائے — گھونگھٹ سپاہ کھا گئی ڈھالوں سے منہ چھپائے
زینبؑ کے لال جھپٹے جدھر بار دھار میں
تھرائے بھائی چھپ گیا بھائی کی آڑ میں

بھاگے بری طرح سے سواران خود پسند — سب کاٹھیاں جھکی ہوئی بھڑکے ہوئے سمند
نیچی ہر اک رکاب ادھر کی ادھر بلند — سالم تھی کوئی باگ نہ پوری تھی زیر بند
زرہوں کی طرح زین کے دامن پھٹے ہوئے
دونوں طرف لٹکتے تھے جوشن کٹے ہوئے

〰〰〰

یاں تو یہ معرکہ ہے ادھر اہلبیت شاہ — مضطر ہیں سن رہے ہیں جو غوغائے رزمگاہ
فضہ نے کی بلندی محمل سے جو نگاہ — چلائی پیٹ کر کہ دہائی ہے یا اللہ
ہے ہے یہ کیسی فوج ہے کون اہل جور ہیں
تلواریں کھنچ گئی ہیں، لڑائی کے طور ہیں

بلوہ ہے ہر طرف سے بڑھ آئے ہیں نابکار — باندھے ہیں سرکشی پہ کمر سب ستم شعار
برہم ہیں اس طرف شہ بیکس کے جاں نثار — لو صاحبو وہ بڑھ گئے عباس نامدار
نیزے بڑھے ہیں واں سے کہ روکیں دلیر کو
جنگل کو زلزلہ ہے وہ غصہ ہے شیر کو

لو، اب صفوں پہ اکبر عالی ہمم چلے — قاسم بھی لو پہنچ گئے، دونوں بہم چلے
پوتوں پہ لو، عقیل کے، اہل ستم چلے — لو سب ادھر سے یاور شاہ امم چلے

ہیں چاک آستینوں کے اوپر چڑھے ہوئے
لڑکے ہیں کچھ جوانوں سے آگے بڑھے ہوئے

بھاگا ہے کوئی افسر فوج دغا شیم   جھپٹے ہیں اس پہ عون و محمد لقب حشم
غصہ ہے، ننھے ہاتھوں میں ہیں تیغے علم   بڑھ بڑھ کے تھام لیتے ہیں اکبر جو دم بدم
کرتے ہیں عرض چھوڑئیے خود سر پہ جا پڑیں
بچے مچل گئے ہیں کہ لشکر پہ جا پڑیں

ہے ہے کوئی جوان میں سے زخمی ہوا کہیں   کیا جانئے کہ روئیں گے کتنا امام دیں
رنگ اڑ گئے یہ سن کے کانپی سر اک حزیں   غل پڑ گیا دہائی ہے یا ختم المرسلیں
رد کیجیے اس امت بد کی نہیہ کو
بھجوائیے نجف سے عذاب امیہ کو

زینب بھی مضطرب ہوئیں سن کے طفلوں کا حال   پر یہ علی کی بیٹی ہیں، غیظ آگیا کمال
بولیں نہ رو و صاحبو، حامی ہے ذوالجلال   دیکھو، کدھر ہیں دیکھو تو عباس خوش خصال
جلدی مری طرف سے قسم دے پکار کے
بھیا بھگا دو فوج کو تلوار مار کے!

حیدر کی طرح بڑھ کے الٹ دو یہ رن ہے کیا   توڑو پروں کو مجمع پیمان شکن ہے کیا
روکیں بدن سے کیا، کوئی فولاد تن ہے کیا   تم سا بھی دوسرا کوئی شمشیر زن ہے کیا
عادی ہیں حرب و ضرب میں ڈھالوں کی آڑ کے
دھنس جاؤ دل میں فوج کے بادل کو پھاڑ کے

قبضہ پکڑ کے صارم خارا شگاف کا   منہ ٹھوکروں سے توڑ دو اہل گزاف کا
باقی رکھو نشان نہ سپاہ خلاف کا   طبقہ الٹ پلٹ دو زمین مصاف کا
رن ہو، نہ دشت ہو، نہ ترائی، نہ گھاٹ ہو
کوفے تلک ایک خون کی ندی کا پاٹ ہو

باطل پرست ہیں، کوئی حق بیں نہ حق پژوہ   جلدی مٹا دو لشکر مغرور کا شکوہ
یوں گھیر لو کہ بھاگنے پائے نہ یہ گروہ   اس طرح حملہ ور ہو کہ مثل صدائے کوہ

نعروں کے ساتھ ظلم کا رن بولنے لگے!
جب غل علی علیؑ کا ہو، رن بولنے لگے!

بچوں سے تیغیں چھین لو، پہونچے مڑ موڑ کے ٹکو نشان، پھینک دو نیزوں کو توڑ کے
صفین میں یہی تھے کہ جی چھوڑ چھوڑ کے کیا کیا صفوں سے بھاگے تھے منھ موڑ موڑ کے

کیوں یاد ہے وہ رن سے پلٹنا ظفر کیساتھ؟
بھیّا، تم ان سے لڑ بھی چکے ہو، ہویدا کیا تھا!"

حضرت زینبؑ کی زبان سے جو کچھ فارغ نے کہلایا ہے۔ میر انیس نے اپنے مرثیے میں اس کے بالکل برعکس تقریر اس بنت فاطمہؑ کی طرف منسوب کی ہے یعنی یہاں ترغیب جنگ ہے، وہاں لڑائی سے باز رہنے پر اصرار۔ بعد کے مرثیہ گویوں نے اس مقام کے بیان میں میر انیس ہی کی تاسی کی ہے۔ فارغ کی جدت طرازی نے اسی فرسودہ گوشے کو تازگی بخش دی ہے۔ لیکن فارغ نے جس طرح یہاں حضرت زینب کی زبانی جناب عباس کو جنگ کرنے کا جوش دلایا ہے۔ بالکل اسی طرح میر انیس نے انھیں بنت علیؑ کی زبان سے اپنے بیٹوں کا شوق جنگ ابھارنے اور انھیں نڈری و بے جگری سے لڑنے کا اور صفوں کو پامال کرنے کا جوش دلانا بیان کیا ہے۔ استاد و شاگرد کے فرق کو نمایاں کرنے کے لیے چند بند اس مقام کے ملاحظہ کیجیے :۔

اعدا کو میرے دودھ کی تاثیر دکھانا دادا کی طرح جوہر شمشیر دکھانا
اجلال حسنؑ، شوکت شبیرؑ دکھانا تن تن کے یداللہ کی تصویر دکھانا
نیزوں سے جوانوں کے جگر توڑ کے آنا
خیبر کی طرح کوفے کا در توڑ کے آنا

نیزوں کی طرف چھاتیاں تانے ہوئے جانا ہاں تیروں کی بارش میں سپر منھ پہ نہ لانا
ہنس ہنس کے میں قربان گئی برچھیاں کھانا لازم ہے وہ ہمت کہ معرف ہو زمانہ
اس جنگ کا چرچا سحر و شام رہے گا
دنیا میں اگر تم نہ رہے، نام رہے گا

میلے نہ ہوں تیور، یہ سپاہی کے ہنر ہیں — جس کے ہیں، بس اسکے ہیں، جدھر ہیں، بس ادھر ہیں
گہہ عطر میں ڈوبے ہیں، گہے خون میں تر ہیں — صحبت میں مصاحب ہیں، لڑائی میں سپر ہیں
وہ اور کسی کے لئے نہ جھکیں گے، نہ جھکے ہیں
عزت میں نہ فرق آئے کہ سر بیچ چکے ہیں

دریا کی طرف پیاس میں تکتے نہیں غازی — گر شیر بھی جھپٹے تو سرکتے نہیں غازی
تلواروں میں آنکھوں کو جھپکتے نہیں غازی — بجلی بھی گرے گر، تو جھجکتے نہیں غازی
دم ہونٹوں پہ آئے تو شجاعت نہیں جاتی!
مرنے پہ بھی چہرے کی متانت نہیں جاتی!

جان ہونٹوں پہ آجائے اگر پیاس کے مارے — غش کھا کے گرو بھی، تو دریا کے کنارے!
پانی کو ترستے رفقا، مر گئے سارے — یہ آبِ رواں تیغ ہے، راہوں پہ ہمارے
تلواریں ہیں، موجوں کی روانی نہ سمجھنا
دریا ہے لہو کا، اسے پانی نہ سمجھنا

۷۔ مرثیہ میں صورت و سیرت کا بیان

مرثیہ گویوں پر معترضین کا یہ اعتراض بالکل صحیح و درست ہے کہ معرکۂ کربلا میں حصہ لینے والے امام زادوں اور خود امام انام کی صورت اس طرح نہیں بیان کی گئی ہے۔ کہ ہماری آنکھوں میں ان ذوات مقدسہ کی تصویر پھر جائے۔ ہر ایک کے دست بازو شکل وصورت کے بیان میں بجائے صحیح خد و خال کی مرقع کشی کے یکساں طور کے استعارات وتشبیہات سے کام لیا گیا ہے۔ سن وسال اور قد وقامت کا فرق تو کسی قدر ضرور نمایاں ہوتا ہے، ورنہ چہرے چہرے کی نورانیت، بینی وگوش وچشم و ابرو کی خصوصیت، لب ودندان کی صفت، دست وبازو کی قوت، گردن کی مضبوطی، سینہ کی فراخی، تمام اعضاء کی چستی ومضبوطی ایک ہی جیسی ہے۔

مگر بعض مرثیہ گویوں نے صحیح حلیہ بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے سرخیل فراست زیدپوری ہیں۔ اس کی ایک مثال آگے آئے گی۔

صورت کی طرح سیرت پر بھی یکسانیت کا اعتراض کیا جاتا ہے۔ مگر حقیقتاً یہ اعتراض درست نہیں۔ عونؑ و محمدؑ کی سیرت کچھ اور ہے، حضرت قاسمؑ و علی اکبرؑ کی کچھ اور، حضرت عباسؑ اپنے قد و قامت، غیظ و غضب، غیرت و حمیت، جرات و ہمت، تیغ زنی و صف شکنی کے ساتھ ساتھ اپنی وفا شعاری اور اطاعت امام میں نمایاں ہیں۔ حرؑ کی سیرت میں خاصی پیچیدگی ہے وہ ایک ایسے خاندان کی فرد ہے جو بنی امیہ کے طرفداروں میں سے تھا۔ پھر خود فوجی افسر ہے۔ ایک ہزار سواروں کے رسالے کا سردار فوجی ڈسپلن میں جکڑا ہوا۔ اُسے جو حکم ابن زیاد کی جانب سے ملا، وہ اسے حرف بہ حرف بجا لایا۔ امام کو گھیر کر کربلا جیسے بے آب و گیاہ مقام پر لایا۔ مگر امام کے رویہ سے دل متاثر ہوا۔ فرات پر خیمے برپا کرنے کی اجازت دے دی۔ عمر سعد کے لشکر نے وہاں سے خیمے اکھڑوا دیئے۔ حر برابر نویں محرم سے اسی کوشش میں لگا رہا کہ صلح ہو جائے۔ جنگ نہ ہونے پائے۔ جب نویں محرم کی شام کو یہ تازہ حکم پہونچا کہ یا تو امام سے بیعت یزید لو یا الحسینؑ اور ان کے اصحاب و اعزا کو قتل کر کے ان کے سر لاؤ۔ تو حرؑ کو اپنی غلطی کا احساس شدت سے ہوا۔ اور اس نے اپنا ہی نہیں بلکہ اپنے پورے خاندان کے برباد ہو جانے کا خیال ترک کر کے شہادت کا جلیل القدر مرتبہ حاصل کرنے کا عزم کیا اور امام کی خدمت میں حاضر ہو کر دست بستہ معافی مانگی اور مع فرزندان و غلام کے جام شہادت پی کر ابدالآباد تک کے لئے سرافرازی و سُرخروئی حاصل کی۔

اب مختلف مرثیوں سے صورت و سیرت کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

شوکت تھانوی

(۲ الف) اُردو کے مشہور مزاح نگار شوکت تھانوی شعر بھی کہتے تھے سنجیدہ اور ظریفانہ دونوں طرح کے انھوں نے بھی "شہادت عظمیٰ" کے نام سے ایک مسدس مرثیہ نظم کیا ہے۔ ابتدا یوں کی ہے۔

آ اے قلم کہ تجھ کو سعادت عطا کریں — جنبش میں تجھ کو لائیں ترا حق ادا کریں
جس غم میں مبتلا ہیں، تجھے مبتلا کریں — تیری زباں سے ذکرِ شہِ کربلا کریں
ذکرِ حسینؑ اصل میں ذکرِ رسول ہے
یہ وہ منقبت ہے جو سب کو قبول ہے

شوکت تھانوی نے امام حسینؑ کی صغیر سنی کی سیرت و کردار کی نقشہ کشی کی ہے اور رسولِ مقبول نے جو کچھ اپنے اس پیارے نواسے کے بارے میں فرمایا ہے اسے نظم کا جامہ پہنا کر بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں اس مقام کے چند بند، بچپن ہی سے اس شہیدِ انسانیت کا کردار کتنا روشن و منوّر ہے:

ذی فہم باشعور، خردمند، بردبار ۔۔۔ معصومیت کے ساتھ ابھی سے عجب وقار
عزمِ بلند اور طبیعت میں انکسار ۔۔۔ جرأت کا معرکہ ہو تو شمشیرِ آبدار
میزانِ حق پہ ظاہر و باطن تلا ہوا
رکھا ہو جیسے سامنے قرآن کھلا ہوا

معصوم عمر، کھیل کے دن اور یہ شعور ۔۔۔ نادانیوں کے دور میں نادانیوں سے دور
اس کمسنی میں اور یہ قرآن پر عبور ۔۔۔ نانا بھی دیکھتے تھے نواسے میں اپنا نور
کہتے تھے "نور کر و نور عین ہے
میرا حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے"

کہتے تھے خود رسولؐ کہ "بیٹھا ہوں قبلہ رو ۔۔۔ مجھ سا مرے حسینؑ کو پاؤ گے ہو بہو
عادات میں کہیں سے نہیں فرق مو بمو ۔۔۔ دیکھو مرے حسینؑ میں میری ہر ایک خو
میں خود کو دیکھتا ہوں تو ہوں سر بسر حسینؑ
آئینہ سامنے ہے ادھر میں ادھر حسینؑ

بچپن کی جیسے میری ہی تصویر ہیں حسینؑ ۔۔۔ یہ واقعہ ہے میری ہی تنویر ہیں حسینؑ
میرے ہی ایک خواب کی تعبیر ہیں حسینؑ ۔۔۔ قرآن میرے لب پہ ہے تفسیر ہیں حسینؑ
پیغام بر ہوں میں مرا پیغام ہیں حسینؑ
انسان کی شکل میں مرا اسلام ہیں حسینؑ

"میرے تصورات جسامت میں ڈھل گئے ۔۔۔ میرے تخیلات حقیقت میں ڈھل گئے
میرے تمام قول صداقت میں ڈھل گئے ۔۔۔ میرے حسینؑ میری رسالت میں ڈھل گئے
قانونِ کبریا کے یہی اب وکیل ہیں
میرے ہر ایک دعوے کی یہ خود دلیل ہیں

خالق نے ان کو بخشا ہے اسلام کا مزاج — قرآن ان کے سر پہ ہے اور ٹھوکروں میں تاج
یہ وہ گدا ہیں جن کو سلاطین دیں خراج — سلطان ہیں قلوب کے، ہر دل میں ان کا راج
جو اہلِ دل نہیں ہے وہ انسان ہی نہیں
چاہے نہ جو انھیں وہ مسلمان ہی نہیں!

اس بلند کردار کا یہ کیا کہنا جس کی تعریف و تحسین خاتم الانبیاء ما ینطق عن الھویٰ اپنی زبان مقدس سے یوں فرمائیں۔ اس سیرت میں وہ تمام محاسن و کمالات اکمل ترین صورت میں موجود تھے جس کی دعا سیدۃ النساء العالمین لختِ جگر رسولؐ، جناب فاطمہ زہراؑ نے بارگاہ اقدس میں رو رو کر مانگی تھی۔ مادر گرامی اور فرزند مقدس، دونوں کی سیرت پر اس دعا سے روشنی پڑتی ہے۔

رو رو کے ہر نماز میں مانگی یہی دعا — یارب مرے حسینؑ کو وہ عزم کر عطا
نانا کی ہر امید کا ہو جس سے حق ادا — جو کچھ وہ چاہتے ہیں یہ اس سے بھی ہو سوا
اب تیرے ہاتھ ہے مرے دستِ دعا کی لاج
بابا کی آرزو ہے، مری التجا کی لاج

منزل اگر ہے تو، تو اسے رہنما بنا — امت کو دکھ دیا ہے، تو اس کو دوا بنا
تو جانتا ہے تجھ سے کہوں کیا کہ کیا بنا — مشکلکشا کے لال کو مشکلکشا بنا
بھولے نہ یہ کبھی کہ نواسا نبی کا ہوں
یہ بھی ہو اس کو پاس کہ بیٹا علیؑ کا ہوں

باطل کے سامنے نہ جھکائے کبھی یہ سر — باطل کی طاقتوں کو نہ خود اس سے ہو مفر
تلوار گر اٹھائے کبھی تیرے نام پر — باطل کے مورچوں میں ہو اک شورِ الحذر
زندہ اگر رہے تو ترے نام کے لئے
برحق ہے موت، ہو مگر اسلام کے لئے!

امام ششم کا حلیہ مبارک

فراست زیدپوری
فراست زیدپوری نے بعض آئمہ کا حلیہ بیان کرنے میں اپنے پیش روؤں سے زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کے بیان سے ہمارے سامنے ایک پوری تصویر آجاتی ہے۔ جس پر اکثر مرثیہ گویوں کی زیادتی تشبیہات واستعارات نے پردہ سا ڈال رکھا ہے۔ ان کے ماہ کامل، سے امام جعفر صادق کا حلیہ مبارک ملاحظہ ہو

حلیۂ امام دیں کا سنیں صاحب شعور
ہاں چشم دل زیارت نہ میں نہ ہو قصور
وہ قد میانہ، رنگ وہ گورا، وہ رخ کا نور
بے انتہا سیاہ تھے موئے سر حضور
گھونگھر پڑے تھے زلف میں چہرے پہ خال تھے
گویا وہ خال نقطۂ جیم جمال تھے

وہ بینی کشیدہ و باریک ضوفشاں
باریک بیں تھے جس کی ستائش میں باریک زباں
ابھرا ہوا تھا بیچ میں بینی کا استخواں
کس منھ سے اس ابھار کی تعریف ہو بیاں
نازاں تھا حسن قدرت پروردگار پر
عاشق کے دل کا جوش خدا اس ابھار پر

کہتے ہیں کہ آئینہ کی طرح پیش سر تھا صاف
اک بال بھی نہ تھا یہی لکھتے ہیں مو شگاف
تھی گول ریش پاک نہیں اس میں اختلاف
بالوں کا خوش نما خط باریک تا بہ ناف
موئے لطیف سینے پہ بے نقش و عیب تھے
اک سطر میں لکھے ہوئے اسرار غیب تھے

شارب زیادہ واضح و روشن ہلال سے
ڈوڈورے تن پہ سرخ تھے خوش رنگ لال سے
انصاف خوش نہیں رگ گل کی مثال سے
واقف ہے کون صنعت خالق کے حال سے
صدقے ہو فکر شاعر نازک خیال کی
سرخی وہ تھی صحیفۂ حسن و جمال کی

ریش سپید تھی عہدِ جوانی میں خوش نما — تا چہرے کی ضو سے تھی شبِ مہتاب کی فضا
پیری کی صبح کا جو سفیدہ نظر پڑا — بھایا خضاب برگِ حنا چہرے رنگ کا
وہ ریش سرخ وہ رخِ انور جناب کا
تھا مسندِ شفق پہ جلوس آفتاب کا

فوجِ حسینی کی مدح حوروں کی زبانی میر انیس کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے۔

میر انیس

آگے کبھی نہ دیکھی تھی اس حسن کی سپاہ — دنیا بھی خوبیوں کا مرقع ہے واہ واہ
دیکھیں کسے کسے کہ ہے اک اک پہ رشک ماہ — جاتی ہے جب کے رخ پہ، تو پھرتی نہیں نگاہ
دیکھو انھیں دموں سے ہے رونق زمین کو
چن کر حسینؑ لائے ہیں کس کس حسین کو

ہم شکلِ مصطفیٰ کا ہے کیا حسن کیا جمال — صبح جبیں بھی اور شبِ گیسو بھی بے مثال
یہ لب، یہ خط، یہ چشم، یہ ابرو، یہ رخ، یہ خال — یاقوت و مشک و نرگس و نجم و مہ و ہلال
اک گل پہ یاں ہزار طرح کی بہار ہے
چہرہ نہ کہیے، قدرتِ پروردگار ہے

لختِ دلِ حسنؑ بھی ہے کس مرتبہ حسین — اس کے چراغِ حسن سے روشن ہے سرزمیں
یہ زلفِ مشک بیز، یہ آئینۂ جبیں — سرمایۂ خطا و ختن، کائنات چیں
رخ کی بلائیں لیتی ہیں پریاں کھڑی ہوئی
سہرے کی ہر لڑی سے ہیں آنکھیں لڑی ہوئی

نامِ خدا، ہیں عون و محمدؑ بھی کیا شکیل — اک مہرِ بے نظیر ہے، اک بدرِ بے عدیل
افروختہ ہیں رخ، یہ شجاعت کی ہے دلیل — ہمت بڑی ہے، گو کہ ہیں عمریں ابھی قلیل
مثلِ علی ہیں جنگ و جدل پر تلے ہوئے
دونوں کے نیمچوں کے ہیں ڈورے کھلے ہوئے

عباسِ نامور بھی عجب، سج کا ہے جواں — نازاں ہے جس کے دوشِ منور پہ خود نشاں
حمزہ کا رعب، صولتِ جعفر علی کی شان — ہاشم کا دل، حسینؑ کا بازو، حسن کی جان

کیونکر نہ عشق ہو شہِ گردوں جناب کو
حاصل ہیں سیکڑوں شرف اس آفتاب کو

اس مہر کو تو دیکھو یہ ذرے ہیں جس کے سب — سرتاجِ آسمان و زمین نورِ عرشِ رب
ابرِ کرم، خدیوِ عجم، خسروِ عرب — عالی ہمم، امامِ اُمم، شاہِ تشنہ لب
جنباں زبانِ خشک ہے ذکرِ الٰہ میں
گویا کھڑے ہیں ختمِ رُسل رزم گاہ میں

(د) امام حسین کے لباس اور اسلحے کا بیان بھی اسی قادر الکلام شہنشاہِ مرثیہ گوئی سے سنیے:

معراج میں رسول نے پہنا تھا جو لباس — کشتی میں لائیں زینبؑ اسے شاہِ دیں کے پاس
سر پر رکھا عمامۂ سردارِ حق شناس — پہنی قبائے پاکِ رسولِ فلک اساس
برمن درست و چست تھا جامہ رسول کا
رومال فاطمہ کا، عمامہ رسول کا

شملے کے دو سرے جو پڑے تھے بصد وقار — ثابت یہ تھا کہ دوش پہ گیسو پڑے ہیں چار
بل کھا رہا تھا زلفِ سمن بو کا تار تار — جس کے ہر ایک مو پہ خطا و ختن نثار
مشک و عبیر و عود اگر ہیں تو ہیچ ہیں
سنبل پہ کیا کھلیں گے یہ گیسو کے پیچ ہیں

کپڑوں سے آ رہی تھی رسولؐ زمن کی بو — دولھا نے سونگھی ہو گی نہ ایسی دلھن کی بو
حیدرؑ کی، فاطمہؑ کی، حسینؑ حسنؑ کی، بو — پھیلی ہوئی تھی چاروں طرف پنجتن کی بو
لٹتا تھا عطر وادیٔ عنبر سرشت میں
گل جھومتے تھے باغ میں، رضواں بہشت میں

صندوق اسلحہ کے جو کھلوائے شاہ نے — آنسو بہائے زینبِ عصمت پناہ نے
پہنی زرہ امامِ فلک بارگاہ نے — بازو پہ جوشنین پڑھے عزّ و جاہ نے
جوہر بدن کے حسن سے سارے چمک گئے
حلقے تھے جتنے، اتنے ستارے چمک گئے

یاد آگئے علی، نظر آئی جو ذوالفقار ! قبضے کو چوم کر سر دیں روئے زار زار
تولی جو رے کے ہاتھ میں شمشیر آبدار شوکت نے دی صدا کہ تری شان کے نثار

فتح و ظفر قریب ہو، نصرت قریب ہے
زیب اس کی تجھ کو، ضرب عدو کو نصیب ہے!

باندھی کمر سے تیغ جو زہرا کے لال نے پھاڑا فلک پہ اپنا گریباں ہلال نے
دستانے پہنے سرورِ قدسی خصال نے معراج پائی دوش پہ حمزہ کی ڈھال نے

رتبہ بلند تھا کہ سعادت نشان تھی
ساری سپر میں مہر نبوت کی شان تھی

اصحابِ حسینؑ کی سیرت

(۱) پہلے میر انیس کی زبان سے سنئے، پھر ان کے ایک شاگرد کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے:۔

کیا فوجِ حسینی کے جوانانِ حسیں تھے کیا زاہد و ابرار تھے کیا صاحبِ دیں تھے
آگاہ دل و اہلِ وفا، اہلِ یقیں تھے غنچہ دہن و مہر لقا، ماہ جبیں تھے

ایک ایک کے مرقد پہ فدا ہوتی ہے زہراؑ
عاشور سے بس آج تلک روتی ہے زہراؑ

وہ عاشقِ صادق تھے، وہ تھے مومنِ کامل دی تھی انہیں خالق نے تمیزِ حق و باطل
کیا ہوش تھا، کیا فہم تھی، کیا عقل تھی کیا دل کیا حسن سے طے کر گئے وہ عشق کی منزل

محراب عبادت خمِ شمشیر کو سمجھے
جادہ وہ مسافر دمِ شمشیر کو سمجھے

دنیا کے نہ خواہاں تھے، نہ تھی خواہشِ مال تھے دوست فقیروں کے نہ تھی حُبِّ زر و مال
نہ یادِ وطن تھی، نہ انہیں الفتِ اطفال شبیر کے عاشق تھے، زہے بخت خوش احوال

مذکور یہ تھا جی سے گزر جائیں گے پہلے!
اس بات پر مرتے تھے کہ مر جائیں گے پہلے

مقبولِ خدائے دوجہاں تھے وہ جوانمرد
مرجانے پہ سرگرم تھے اور زیست سے دل سرد
ایک ایک جری دفترِ کونین میں تھا فرد
تابندہ تھے خورشید کی صورت رخِ پر گرد
ایسے کسی تسبیح کو کب دانے ملے تھے
کس شمع کو اس طرح کے پروانے ملے تھے

مستِ مئے عرفان تھے وہ سب عاقل و ذی ہوش
تھی غیرِ خدا سبکی انھیں یاد فراموش
دنیا سے بری، بارِ علائق سے سبکدوش
دل یادِ الٰہی میں جو یوں دیکھو تو خاموش
ہر دم سرِ تسلیم تھا خم راہِ خدا میں
بڑھتے چلے جاتے تھے قدم راہِ خدا میں

وہ صوتِ حسن اور وہ اثر دار دعائیں
وہ چاند سے رخ اور وہ نورانی عبائیں
وہ ان کی عباؤں کے تلے تنگ قبائیں
وہ دوش پہ شملے، وہ عمامے وہ ردائیں
نہ حور میں یہ حسن نہ انساں نہ پری میں
گویا ملک اترے تھے لباسِ بشری میں

ہمت سے توانا، یہ ریاضت سے بدن زار
مرنے پہ کمر باندھے شہادت کے طلبگار
غربت، الم، فاقہ کشی، زردیٔ رخسار
سوکھے ہوئے ہونٹوں سے عیاں پیاس کے آثار
تسبیحِ خدائے دوجہاں وردِ زباں تھی
بیداریِ شب رتجگی آنکھوں سے عیاں تھی

کیا کیا نہ اذیت تھی پہ تھے صابر و شاکر
مولا کی محبت تھی، ہر اک بات میں ظاہر
سر دینے کو موجود، فدا ہونے کو حاضر
اس بھوک میں ثابت قدم، اس پیاس میں صابر
کھائے تبر و تیر یہ غمخواری کا حق تھا
وہ کر گئے غازی جو وفاداری کا حق تھا

حقا کہ عجب فوج تھی فوجِ شہِ ابرار
جن لوگوں کا عباسِ دلاور سا علمدار
ہم شکلِ پیمبر سا جواں فوج کا سالار
مختار وہ مختار تھا جو خلق کا مختار
ایسا کسی سردار نے لشکر نہیں پایا
لشکر نے بھی ایسا کبھی سردار نہیں پایا

اٹھارہ تھے فرزند پیمبر کے یگانے — اک رشتے میں جا گہ انھیں بخشی تھی خدا نے
پالا تھا انھیں گود میں شاہ شہدا نے — عاشور کو ہاتھ ان پر کیا صاف قضا نے
وہ فاطمہ کے نخل جو پھولے نہ پھلے تھے
مقتل میں ستم گاروں کی تیغوں کے تلے تھے

کچھ طفل تھے اور تازہ جواں تھے کئی خوش خو — خوش ظاہر و خوش باطن و خوش قامت و خوش رو
وہ چاند سے رخ اور وہ گوندھے ہوئے گیسو — کوسوں تلک اُن فاطمہ کے پھولوں کی تھی خوشبو
مرجانے کی فاقہ میں وہ قسم کھائے ہوئے تھے
پانی کا جو تھا قحط تو مرجھائے ہوئے تھے

لڑ کر جو کئی پہلے پہل نکلے تھے گھر سے — ہر صف کی طرف تکتے تھے شیروں کی نظر سے
چھوٹے سے لٹکائے ہوئے ہتھیار کمر سے — کہتے تھے وہ نکلتا نہیں اب کوئی ادھر سے
یہ دیر ہے کیوں اس سے بھلا فائدہ کیا ہے
میدان میں چمکنے لگیں تیغیں تو مزا ہے

چلنے لگے تلوار کھلیں شیروں کے جوہر — دیکھیں تو بھلا کس نے کسے کر دیا بے سر
میدان سے پھرا کون ہزاروں کو بھگا کر — ہاں دیکھیں تو کس نے تہ و بالا کیا لشکر
رہوار کو چمکا کے ہزاروں پہ گرا کون
فوج ستم آرا کے نشاں لے کے پھرا کون

دو لاکھ میں کس نے پسر سعد کو مارا — کس نے سر شمر ستم ایجاد اتارا
تلوار سے کس نے کیا خونی کو دوپارا — خالی کیا کس شیر نے دریا کا کنارا
لو فتح ہوئی کون خبر دیتا ہے آ کر
گڑتا ہے نشاں کس کا در کوفہ پہ جا کر

بولا کوئی حضرت ہمیں پہلے جو رضا دیں — لڑکے ہیں یہ زور اسد اللہ دکھا دیں
عونی یہ نہیں کرتے کہ لشکر کو بھگا دیں — اک حملے میں دو چار صفوں کو تو مٹا دیں
ناچار ہیں پر پیاس سے غش کھا کے گرینگے
اس کی بھی قسم ہے لو کہ جیتے نہ پھرینگے

ف: اسی سرخیل مرثیہ گویان سے ایک بار پھر اصحابِ اعوانِ حسین کی سیرت کے درخشاں خصوصیات سُن لیجئے۔ صبحِ عاشور کا منظر بھی قابلِ دید ہے۔

صبح صادق کا ہوا چرخ پہ جس وقت ظہور
زمزمے کرنے لگے یادِ الٰہی میں طیور
مثلِ خورشید برآمد ہوئے خیمہ سے حضور
یک بیک پھیل گیا چار طرف دشت میں نور
شش جہت میں رُخِ مولا سے ظہورِ حق تھا
صبح کا ذکر ہے کیا چاند کا چہرہ فق تھا

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں وہ بیابانِ سحر
دم بدم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر
اوس نے فرشِ زمرد پہ بچھائے تھے گہر
لوٹی جاتی تھی لہکتے ہوئے سبزے پہ نظر
دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آتی تھی
صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی

بلبلوں کی وہ صدائیں وہ گلوں کی خوشبو
دل کو الجھاتے تھے سنبل کے وہ پُرخم گیسو
قمریاں کہتی تھیں شمشاد پہ یاہو، یاہو
فاختہ کی یہ صدا سرو پہ تھی "کو کو، کو"
وقت تسبیح کا تھا عشق کا دم بھرتے تھے
اپنے معبود کی سب حمد و ثنا کرتے تھے

آئے سجادۂ طاعت پہ امامِ دو جہاں
اُس طرف طبل بجا یاں ہوئی لشکر میں اذاں
وہ مصلی کہ زباں جن کی حدیث و قرآں
وہ نمازی کہ جو ایماں کے تنِ پاک کی جاں
زاہد ایسے تھے کہ ممتاز تھے ابراروں میں
عابد ایسے تھے کہ سجدے کئے تلواروں میں

عرشِ اعظم کو ہلاتی تھیں دعائیں ان کی
وجد کرتے ملک سُن کے صدائیں ان کی
وہ عمامے وہ قبائیں وہ عبائیں ان کی
حوریں لیتی تھیں بصد شوق بلائیں انکی
ذکرِ خالق میں لب ان کے جو ہلے جاتے تھے
غنچے فردوس کے شادی سے کھلے جاتے تھے

کیا جوانانِ خوش اطوار تھے سبحان اللہ
کیا رفیقانِ وفادار تھے سبحان اللہ
صفدر و غازی و جرار تھے سبحان اللہ
زاہد و عابد و ابرار تھے سبحان اللہ

زن و فرزند سے فرقت ہوئی مسکن چھوڑا
مگر احمدؐ کے نواسے کا نہ دامن چھوڑا

اللہ اللہ عجب فوج عجب غازی تھے | عجب اسوار تھے بے مثل عجب تازی تھے
لائق مدح و ثنا اور سر افرازی تھے | گو بہت کم تھے یہ آمادہ جاں بازی تھے

پیاس ایسی تھی کہ آ آ گئی جاں ہونٹوں تک
صابر ایسے تھے کہ پھیری نہ زباں ہونٹوں پر

زہد میں حضرت سلماں کے برابر کوئی | دولت فقر و قناعت میں ابوذر کوئی
صدق گفتار میں عمّار کا ہمسر کوئی | حمزۂ عصر کوئی، مالکِ اشتر کوئی

ہوں گے ایسے ہی محمدؐ کے جو شیدا ہونگے
پھر جہاد ایسا نہ ہوگا، نہ وہ پیدا ہونگے

گو مصیبت میں تلاطم میں تباہی میں رہے | سر کٹے پاؤں مگر راہ الٰہی میں رہے
یوں سر افراز وہ سب لشکر شاہی میں رہے | جس طرح تیغ دو دم دستِ سپاہی میں رہے

اس مصیبت میں نہ پایا کبھی شاکی ان کو
آبرو ساقیؑ کوثر نے عطا کی اُن کو

وہ تخشّع وہ تضرّع، وہ قیام اور وہ قعود | وہ تذلّل، وہ دعائیں، وہ رکوع اور سجود
یادِ حق دل میں تو سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ درود | یہ دُعا خالق اکبر سے کہ اے ربِّ ودود

یوں کٹیں ہم کہ نہ آل اور نہ اولاد رہے
مگر احمدؐ کے نواسے کا گھر آباد رہے

موم فولاد ہو آوازوں میں وہ سوز و گداز | اپنے معبود سے سجدوں میں عجب راز و نیاز
شبِ تاروں پہ تھے عرش معلّیٰ پہ نماز | شیر دل، منتخب دہر، وحید و ممتاز

چاند شرمندہ ہو چہرے کی تجلّی ایسے
نہ امام ایسا ہوا پھر نہ مصلّی ایسے

جب فریضے کو ادا کر چکے وہ خوش کردار | کس کے کمروں کو بعد شوق لگائے ہتھیار
جلوہ فرما ہوئے گھوڑے پہ بہ شہ عرش وقار | علم فوج کو عباسؑ نے کھولا اک بار

دشت میں نکہت فردوس بریں آنے لگی
عرش تک اسد کے پھریرے کی ہوا جانے لگی

وہ علمدار کہ جو شیر الٰہی کا خلف — گوہر بحر وفا، نیّرِ دریائے نجف
فخر حمزہ سے نمودار کا جعفر کا شرف — کس طرح چاند کہوں، چاند میں ہے عیب کلف
کس نے پایا وہ جو تھا جاہ و حشم ان کے لئے
یہ علم کے لئے تھے اور علم ان کے لئے

سرو شرمائے قد اس طرح کا قامت ایسی — اسد اللہ کی تصویر تھے صورت ایسی
شیر لغزوں سے دہل جاتے تھے صولت ایسی — جل کے پانی نہ پیا نہر میں، ہمت ایسی
جان جب تک تھی اطاعت میں رہے بھائی کی
تھے علمدار، مگر بچوں کی سقائی کی

وہ بہشتی نے کیا جس کو وفا کہتے ہیں — سب انھیں عاشق شاہِ شہدا کہتے ہیں
ان کو قبلہ تو انھیں قبلہ نما کہتے ہیں — جو بہادر ہیں وہ شمشیر خدا کہتے ہیں
عشق سردار و علمدار کا افسانہ ہے
وہ چراغ رہ دیں ہے، تو یہ پروانہ ہے

اک طرف اکبر مہ رو سا جوانِ نایاب — کچھ جو بچپن تھا تو کچھ آمدِ ایامِ شباب
روشنی چہرے کی یہ ایسی کہ خجل ہو مہتاب — آنکھیں ایسی کہ رہا نرگس شہلا کو حجاب
جس نے ان گیسوؤں میں رخ کی ضیا کو دیکھا
شبِ معراج میں محبوبِ خدا کو دیکھا

ہ خوشا حسنِ رخ یوسف کنعان حسنؑ — راحتِ روح حسینؑ ابن علیؑ، جان حسنؑ
م میں زور علیؑ طبع میں احسان حسنؑ — ہمہ تن خلق حسنؑ، حسنِ حسنؑ، شانِ حسنؑ
تن پہ کرتی تھی نزاکت سے گرانی پوشاک
کیا بھلی لگتی تھی بچپن میں شہابی پوشاک

ءاللہ اسدِ حق کے نواسوں کا جلال — چاند سے چہروں پہ بل کھائے ہوئے زلفوں کے بال
کاندھے پہ رکھے ہوئے مانند ہلال — گرچہ بچپن تھا پہ رستم کو سمجھتے تھے وہ زال

صف سے گھوڑوں کو بڑھا کر جو پلٹ جاتے تھے
مورچے لشکر کفار کے ہٹ جاتے تھے

آستینوں کو چڑھائے ہوئے آمادۂ جنگ — وہی سارا اسد اللہ کا نقشہ وہی ڈھنگ
سرخ چہرے تھے کہ شیروں کا یہی ہوتا ہے رنگ — ولولہ صف کے الٹنے کا لڑائی کی امنگ
جسم پر تیر چلیں، نیزہ و خونخوار چلے
شوق اس کا تھا کہ جلدی کہیں تلوار چلے

یک بیک طبل بجا فوج میں گرجے بادل — کوہ تھرائے زمیں ہل گئی گونجا جنگل
پھول ڈھالوں کے چمکنے لگے تلواروں کے پھل — مرنے والوں کو نظر آنے لگی شکل اجل
واں کے جاوش بڑھانے لگے دل لشکر کا
فوج اسلام میں نعرہ ہوا "یا حیدرؑ" کا

شور میدانیوں میں تھا کہ دلیرو نکلو — نیزہ بازی کرو رہواروں کو پھیرو نکلو
نہر قابو میں ہے اب پیاسوں کو گھیرو نکلو — غازیو صف سے بڑھو غول سے شیرو نکلو
رستمو داد وغا دو کہ یہ دن داد کا ہے
سامنا حیدر کرارؑ کی اولاد کا ہے

شور سادات میں تھا یا شہ مرداں مدد دے — کعبۂ دیں مدد دے، قبلۂ ایماں مدد دے
قوت بازوئے پیغمبر ذی شاں مدد دے — دم تائید ہے اے فخر سلیماں مدد دے
تیسرا فاقہ ہے طاقت میں کمی ہے مولا
طالب قوت ثابت قدمی ہے مولا

پیاس میں حرف نہ شکوے کا زباں پر لائیں! — دم بدم سینوں پہ فاقوں میں سنانیں کھائیں!
دل نہ تڑپے جو ہم زخم نہ پانی پائیں! — تیرے فرزند کی تائید کریں، مر جائیں!
لاشیں مقتل میں ہوں لاشۂ شہ دلگیر کے ساتھ
سر ہوں نیزوں پہ سر حضرت شبیر کے ساتھ

ذوالقدر بہادر محسن جونپوری

اصحابِ حسینؑ کی سیرت ذوالقدر بہادر محسن جونپوری شاگرد انیسؔ و نفیسؔ سے بھی سنئے :-

عشاقِ خدا، عترتِ اطہار کے والہ
ہر بات میں سلمانؓ و ابوذرؓ سے مشابہ
خواہانِ حیاتِ ابدی زیست سے کارہ
دعوے ہیں کہ "اللہ لطیف بعبادہ"
مصروف بیان کرمِ لم یزلی میں
ہے وردِ زبان نادِ علیاً یا علی میں

انصار بردست جگر بند ید اللہ
شیران قوی پنجہ بیشۂ اسد اللہ
ایک ایک کی زباں پر ہے وہ کفانی مرد اللہ
آقا کے بھروسے کے جواں معتمد اللہ
تسلیم و رضا ختم ہے ان حق طلبوں پر
نعرے ہیں "رضیاً بقضا" بہ کے لبوں پر

ہوتے ہیں کہاں نام خدا نامور ایسے
کس بحرِ شرافت کو ملے ہیں گہر ایسے
جن پر ہو فرشتوں کو بھی غبطہ بشر ایسے
ہوش ایسے حواس ایسے، دل ایسے، جگر ایسے
سب خاص مصاحب ہیں ولی ابن ولی کے
سیکھے ہیں ادب گھر سے رسول عربی کے

باتیں نمکین وہ کہ مزا قلب اٹھائے
فقروں میں لطیفے تو اشاروں میں کنائے
یہ دھیان کہ آداب ولا جانے نہ پائے
شادی ہے کہ گھر چھوڑ کے مرجانے کو آئے
سمجھے ہیں گزرگاہِ فنا دار الم کو
ساری یہ خوشی ہے کہ چلے سیر ارم کو

فاقوں سے کئی شب کے، کئی روز کے پیاسے
سیر ایسے کہ دوستیِ آلِ عبا سے
لبریز دہن چاشنیِ صبر و رضا سے
تر خشک زبانیں رطب حمد و ثنا سے
پیاسے ہیں مگر قلب نہیں مضمحل ان کے
ڈوبے ہوئے ہیں چاہ میں کوثر کی دل ان کے

آئینۂ دل گردِ کدورت سے صفا ہیں عقبیٰ کے طلبگار ہیں، دنیا سے خفا ہیں
سب صادق الاقرار ہیں، سب اہلِ وفا ہیں غازی ہیں، مجاہد ہیں، جری ہیں، شرفا ہیں
مقبولِ خدا یاورِ سلطانِ اُمم ہیں
نام ان کے یوں ہیں مصحف دہر اہیں رقم ہیں

سیاف وغا، ہمدم شمشیر الٰہی دی جن کی شجاعت پہ شہادت نے گواہی
ساونت، جری، سور، نمودار سپاہی عالم کی ضیاء، زیب جلوخانۂ شاہی
شملے پہ سرِ دوش عمامے کے پڑے ہیں
باندھے ہوئے کمریں دردولت پہ کھڑے ہیں

سیّد حسین مرزا عشق

عشق نے اپنے ایک مرثیہ میں زعفر جن کی زبانی امام حسینؑ کا جو حال اس نے بچشم خود دیکھا ہے وہ بیان کیا ہے۔

بلا کی منظر کشی کی ہے جس سے نہ صرف بزم قدسیاں کے اضطراب کی کیفیت نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ بلکہ امام حسینؑ کے صبر و تحمل، عزم و استقلال، راضی بہ رضائے الٰہی ہونا اور نانا کی امت کے لئے ایک لافانی اسوۂ حسنہ پیش کرنے کا بالشان تہیہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔ زعفر بیان کرتا ہے:۔

عجب طرح کا مرقع عجیب عالم نور اُدھر ستم تو اِدھر نشان حق کا ظہور
کھلے ہوئے در افلاک دشت کیں معمور ہر ایک سمت کو فوجیں، مگر حسینؑ سے دور
سپاہ شام نے مہرِ علیؑ کو گھیر لیا تھا
چراغ بیچ میں چاروں طرف اندھیرا تھا

محال تھا کوئی پہنچے امامِ عالم تک مگر بہشت کے پھولوں کی آرہی تھی مہک
زمیں بلند تھی گویا جھکے ہوئے تھے فلک کہ رزمگاہ سے تا آسماں تھی فوج ملک
فرشتے سینکڑوں آتے اور جاتے تھے
مگر بہ حکمِ خدا بار بار لاتے تھے

”شاد و سب کو جو زہرا کا نورِ عین کہے — نہ بوجھو، نہ اگر شاہ مشرقین کہے
وہی ہے خوب جو حیدر کے دل کا چین کہے — کریں گے ہم بھی وہی آج جو حسینؑ کہے

ہماری راہ میں لڑتا ہے زخم کھاتا ہے
ہمارے پاس ہمارا مجاہد آتا ہے

پیغمبرانِ اولوالعزم تھے حسینؑ کے پاس — جنابِ آدمؑ و نوحؑ و خلیل رتبہ شناس
کلیمؑ و حضرت عیسیٰؑ سلیمانِ عالم پاس — محمدؐ عربی پیش ذوالجناح اداس

لپٹ لپٹ کے رسولِ جلیل روتے تھے
رکاب تھامے ہوئے جبرئیلؑ روتے تھے

کھڑے ہوئے تھے بلندی پر اس طرح سرور — کہ تھا نہ پائے مبارک رکاب کے اندر
وہ پاؤں رکھے ہوئے تھے فرس کی گردن پر — اِدھر کے ہاتھ میں تھی ذوالفقار خوں سے تر

اُدھر کے ہاتھ میں تھی باگ اور ڈھال بھی تھی
گماں نہ تھا کہ طبیعت بھی نڈھال بھی تھی

کبھی شہیدوں کی جانب تھی مسکرا کے نظر — کبھی دعا کبھی شکرِ عنایتِ داور
کبھی کسی سے یہ کہنا کہ آ کھڑے ہو اِدھر — کیا مصافحہ اصحابِ کہف سے اکثر

کبھی اڑا کے فرس اہلِ شام پر جانا
کبھی جہاں تھے وہیں آ کے پھر ٹھہر جانا

عجب جلال، عجب رحم، نور کی تصویر — بگڑ گئے جو کبھی کچھ غرور کی تقریر
کیا نہ وار جھکے ہاتھ جوڑ کے وہ شریر — کبھی بڑھے، کبھی شرما کے پھر گئے شبیرؑ

کبھی حزیں کبھی خوش دیکھ کے لعینوں کو
اتارتے تھے چڑھاتے تھے آستینوں کو

سیرت حضرت ابوذر غفاریؓ صحابی رسولؐ

امیر احمد خاں راجہ صاحب محمود آباد

راجہ صاحب محمود آباد نے اپنے ایک مرثیہ میں خباب جون، حبشی غلام حضرت ابوذر غفاری کی جنگ اور شہادت بیان فرمائی ہے۔ اس مجاہد غلام نے اپنے رجز میں اپنے آقا کی سیرت اور کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

جون ہے نام غلام شبر خیبر ہوں میں
اس بڑھاپے میں بھی جوانوں کے برابر ہوں میں
تین دن کی ہے عطش طالب کوثر ہوں میں
خواہش زر نہیں، گو عبد ابوذرؓ ہوں میں
فخر عبدیت شاہ دوجہاں رکھتا ہوں
اس ضعیفی میں بھی امید جواں رکھتا ہوں

وہ ابوذر تھا جنھیں نفس پہ اپنے قابو
رگ و پے میں تھا رواں جن کے شریعت کا لہو
مسجد زہد میں محراب تھے جن کے ابرو
صادق اللہجہ، جری، عالم و دانا خوش خو
خود مٹے دین پیمبر کی نگہبانی کی
فقر نے جس کے زمانے میں سلیمانی کی

جس کے ہر کام سے قائم ہوئی دین کی بنیاد
زر پرستوں کے لئے جس کی زبان تھی نقاد
نور سے جس کے مٹا جاتا تھا باطل کا سواد
جو مٹاتا رہا نقش و اثر استبداد
زندگی جس کی منافق کے لئے بھاری تھی
شام میں جس کی ہدایت سے ضیا باری تھی

شام میں پند ابوذر نے مچا دی ہلچل
تھا بیاں ان کا پئے کشت دغا برق اجل
صرصر دید سے چھٹنے کفر کے کالے بادل
وعظ کا ابر یہ برسا کہ بھرے سب جل تھل
شام والوں سے نہ یہ بار گراں اٹھتا تھا
چھینٹے پڑتے تھے تو سینوں سے دھواں اٹھتا تھا

دین اسلام تھا صدا اثر ناکامی
نہ تو تھا کوئی مددگار نہ کوئی حامی
برملا مسجدوں میں پیتے تھے بادہ شامی
واہ کیا بات ہے اے سلطنت اسلامی

عیب جتنے تھے ہنر ہو گئے انسانوں میں
مشکیں بھر بھر کے چلی آتی تھیں میخانوں تک

سلطنت سے نہ دبے اور نہ کسی لشکر سے
حق کہا تاکہ نہ شرمندہ ہوں پیغمبر سے
گو اکیلے تھے مگر چھپ کے نہ بیٹھے ڈر سے
منکر مئے دیکھی تو لب چاک کیا خنجر سے
ان کی ہر بات پہ اہلِ جہاں واعظ تھی
حد یہ ہے دشنہ و خنجر کی زباں واعظ تھی

ان کے ہر فتوے سے پڑتے تھے کلیجوں میں گھاؤ
کفر کے دل میں کھٹکتے رہے ان کے برتاؤ
ان کے دریائے مواعظ میں غضب کا تھا بہاؤ
ڈگمگانے لگی ظلم و ستم و شرک کی ناؤ
خرمن جور پہ وہ برق گراتے ہی رہے
آگ پندار کے پانی میں لگاتے ہی رہے!

جمیل مظہری

ط۔ کربلا کی قربانی میں شرکت والی خواتین میں سب سے بلند نمایاں شخصیت جناب زینبؑ کی تھی۔ مدینہ سے روانگی کے وقت جن مصالح کے پیش نظر امام ہمام نے اپنی اس بہن کو ساتھ لیا تھا۔ وہ معرکۂ کربلا اور اس کے بعد کی قید و بند میں ظاہر ہوئے یہ معظمہ نہایت ہی، زیرک و ہوشمند عاقبت اندیش و دور بیں، دانا، دلیر تھیں۔ اور عاشورہ سے پہلے اور دسویں محرم کو جس جس طرح انھوں نے رفقا و اعزا امام کو ان کی رفاقت میں جان دینے پر آمادہ کیا ہے اور ان میں حق کی حمایت کا جوش و ولولہ پیدا کیا ہے، وہ ان کا ایک کارنامہ ہے لیکن اس سے بھی بڑا کارنامہ ہے۔ شہادت کے بعد ان کا بچوں، یتیموں اور بیواؤں کی نگرانی و پاسبانی، کوفے کے بازار میں ان کی تبلیغ اور دربار ابن زیاد اور دربار یزید میں ان کی دلیرانہ گفتگو جس کے ذریعہ امام کی قربانی کی تکمیل ہوئی اور احیاء اسلام کا کام مکمل ہوا۔

شہادت کے بعد پہلی رات کو جناب زینب نے کیا کیا فرائض انجام دیے اور کیا کیا عہد کئے وہ جمیل مظہری کی زبان سے سنیے۔۔۔

بخدا ناشرِ احکامِ خدا تھیں زینبؑ — بانیِ فلسفۂ رسم و عزا تھیں زینبؑ
فاتحِ معرکۂ تسلیم و رضا تھیں زینبؑ — شامِ غربت میں پناہ غربا تھیں زینبؑ
دل پہ رکھ خود جبر کیا، صبر دلایا سب کو
لا کے اِک حلقۂ ماتم میں بٹھایا سب کو

گم تھے بچے تو انھیں ڈھونڈھتی جنگل میں گئیں — کبھی گھبرائی ہوئی فوج کے بادل میں گئیں
کبھی دریا پہ، کبھی خون کے جل تھل میں گئیں — آئی آواز سکینہ کی تو مقتل میں گئیں
مل گئے سب تو اب اشکوں کو پیے بیٹھی ہیں
اپنے سایہ میں یتیموں کو لیے بیٹھی ہیں

موجیں دریا کی ہیں خاموش ہوا نیند میں ہے — بیکسی چپ ہے، اگر وہ شہدا نیند میں ہے
ہر اسیرِ الم و رنج و بلا نیند میں ہے — سو گئی ہے غیرتِ حق، قہرِ خدا نیند میں ہے
کون پہرے پہ ہو بنتِ اسدِ رب کے سوا
کوئی بیدار نہیں ہے دلِ زینبؑ کے سوا

آنکھیں اشکوں سے ہیں نم قلب حزیں اور اداس — بال بکھرے ہیں پریشاں ہیں مگر جمع حواس
ہاتھ میں نیزۂ خطی لئے با حالتِ یاس — کبھی اس لاش کے پاس اور کبھی اس لاش کے پاس
کبھی خیمہ میں ہیں عابدؑ کی چٹائی کے قریب
کبھی عباسؑ کے لاشے پہ ترائی کے قریب

کبھی لاشِ شہِ والا سے یہ کرتی تھیں کلام — آپ نے سونپ دیا ہے مجھے عباسؑ کا کام
بھیجئے ان کو کہ ہلکی ہو مری پیٹھ امام — آپ خاموش ہیں کیوں، لیجئے زینبؑ کا سلام
لائی ہے شدتِ غم اشک فشانی کیلئے
اٹھیے آئی ہے بہن، فاتحہ خوانی کیلئے

کام سونپا ہے تو اب اٹھ کے دعا دیں حضرت — اور مجھے حوصلۂ صبر و رضا دیں حضرت
جذبۂ معرفتِ امرِ خدا دیں حضرت — جو ہدایت کے طریقے ہیں بتا دیں حضرت
آپ کو اک سرِ بے مقنع و چادر کی قسم
آپ کو آپ کے دریں تہہ خنجر کی قسم

مجھ کو اکبر کی قسم، خالقِ اکبر کی قسم
قطرۂ خونِ دلِ بانوئے مضطر کی قسم
جب یہ جبریلؑ نے سجدہ کیا اس در کی قسم
آپ کے بعد جو لوٹا گیا اس گھر کی قسم
کہ مجھے آپ عزیز آپ کا مقصد بھی عزیز
اور ہے مسلکِ ایثار اب وجد بھی عزیز

وعدہ کرتی ہوں کہ جس راہ میں جاؤں گی میں
اس کے ہر موڑ پہ تاریخ بناؤں گی میں
قوم کو آپ کا پیغام سناؤں گی میں
اس کی سوئی ہوئی غیرت کو جگاؤں گی میں
تربیت یافتہ یا شاہِ زمن آپ کی ہوں
یہ بھی سمجھے بھیا کہ بہن آپ کی ہوں

آلِ رضا

یہ:- جناب زینبؑ نے اپنے اس عہد کو کیوں کر پورا کیا۔ وہ جناب آلِ رضا سے سنئے پہلے پس منظر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ کوفہ کا بازار ہے، دوکانوں میں آئینہ بندی کی گئی ہے۔ قتلِ حسینؑ کی عید منائی جا رہی ہے۔ لوگ جوق در جوق اسیروں کا تماشہ دیکھنے کے لئے سرِ راہ کھڑے ہیں۔ بے کجاوہ محملِ اُشتوں پر سوار رسن بستہ کھلے سر آلِ رسول کا کارواں گزر رہا ہے۔ لوگ اپنے بچوں پر سے سوکھے خرمے صدقے کر کے قیدی بچوں کی طرف پھینکتے ہیں۔ نبی زادیوں کی نظرِ تحقیر سے دیکھتے ہوئے فقرے کستے ہیں۔ انھیں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو چھپ چھپ کر مظلوموں پر روتے اور آنسو بھی بہاتے ہیں۔ اور یہ کوفہ وہ مقام ہے جو جناب زینبؑ کے والد محترم حضرت علیؑ کا بحیثیت خلیفۂ چہارم دارالخلافہ رہ چکا ہے اور جہاں سے تقریباً چھ سو خطوط امام حسینؑ کو بلانے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ زینبؑ بنتِ علیؑ کو ان کوفی بہروپیوں کی یہ حالت دیکھ کر غیظ آ گیا۔ آپ نے یہ خطبہ بلیغ ارشاد فرمایا۔

کوفہ کے بازار میں خطبہ

دخترِ حیدرِ کرار کو اب آ گیا جوش
با محل شانِ خطابت سے ندا دی "خاموش"
چھا گیا سناٹا، بنا مجمعِ کوفہ، ہمہ گوش
کان لوگوں کے کھڑے ہو گئے، یہ آ گیا ہوش

اور ہی رنگ تھا اس طرزِ سخن میں گویا
تھی زباں باپ کی بیٹی کے دہن میں گویا

پُر اثر خطبے کا تھا مختصراً یہ مطلب — حمد زیبا ہے اسی کے لئے جو سب کا ہے رب
پھر صلوٰۃ ہوئے ہیں مرے جد شاہِ عرب — جن کی عترت کا بھی مخصوص وہی ہے منصب
اہلِ کوفہ! ہمیں اب دیکھ کے کیا روتے ہو؟
داغ مشکل ہے چھٹے گا جسے اب دھوتے ہو

کیا اسی کے لئے تھا سیدِ ستانِ شباب — سر تماشے کے لئے آئے سرِ نوکِ سناں
کیا یہی عزتِ ناموسِ پیمبر تھی یہاں — آہ بازار کہاں، عترتِ اطہار کہاں
دیکھتے جس سے وہی تارِ نظر کاٹ لیا
اپنے ہی دین کے سردار کا سر کاٹ لیا

اپنے زخموں کے طبیبوں سے یہ چھوٹے وعدے — تم نے وہ کام کیا ہے کہ فلک ٹوٹ پڑے
ہم پہ یہ ظلم و ستم، ہم سے ہدایت پا کے! — بوجھ جو تم نے اٹھایا ہے وہ سر توڑ نہ دے
رنگ کیا گریہ و فغاں کا جمے، ظالم ہو!
کم ہنسو، روؤ زیادہ کہ بڑے ظالم ہو

کیا یہ مہلت بھی، کہ دینا ہے تمہیں مرکے جواب — جس کے قبضہ میں ہے بروقت جہنم کا عذاب
آسماں خون جو برسائے، تو کیا استعجاب — قاتلو! اپنے پیمبر سے بھی آیا نہ حجاب
کون تھا جس کا کہ یوں لاکھ کا گھر خاک کیا
کلمہ پڑھ کے کہو، کس کا جگر چاک کیا

دربارِ ابن زیاد میں تبلیغ اسلام

یہی تبلیغ حق ابن زیاد کے دربار میں بھی اس خاتون نے کی وہ موقع بھی ملاحظہ ہو۔

جھڑکیاں سہتے رہے آلِ نبی، کچھ نہ کہا — آ کے استادہ ہوئے بیٹیں تھی کچھ نہ کہا
حاکمِ شخص نے لی بڑھ کے چھڑی، کچھ نہ کہا — سرِ شبیر سے کی بے ادبی، کچھ نہ کہا

خونِ دل ہوتا رہا، اُف کا اشارہ نہ کیا
کلمۂ حق کا مگر ضبط گوارا نہ کیا

رکھ کے اللہ پہ تہمت جو یہ ظالم نے کہا
جس نے ذلت تمھیں دی، شکر کے قابل ہے خدا
بولی اٹھیں بنتِ علیؑ، شکر ہے اس خالق کا
جس نے بابوجہ محمدؐ ہمیں رتبہ بخشا
ہاں، خدا کرتا ہے ہر فاسق و فاجر کو ذلیل
ہم نہیں ان میں ہوا کرتے ہیں ایسے جو ذلیل

کیا کہا؟ ساتھ مرے بھائی کے کیا حق نے کیا
بہتری اپنی سمجھتی ہوں میں تو اسی میں، جو ہوا
اس نے کی آلِ محمدؐ کو بزرگی یہ عطا
دے دیا جلد شہادت سے تقرب اپنا
فیصلہ والی گھڑی دور نہیں، آتی ہے
بن مرجانہ! نجات ابدی کس کی ہے

دربارِ یزید میں بنتِ علیؑ کے تیور

یہی تیور اس دلیر خاتون کے دربارِ یزید میں بھی تھے۔ یزید تخت پر بیٹھا تھا۔ نیچے طشتِ طلا میں سرِ امام کا رکھا تھا۔ وہ ایک چھڑی سے بار بار امام کے لب و دندان سے بے ادبی کرتا تھا۔

چومتے تھے لب و دندان جو رسولِ عربی
ان پہ لکڑی وائے ستم! چوبِ یزیدِ اموی
حرکتِ چوب پہ پڑھتا تھا کچھ اشعار شقی
کھل گئی نشے میں وہ بات جو کہنے کی نہ تھی
آلِ احمدؐ سے بغاوت کا قصیدہ سنیے
شاہ سے طالبِ بیعت کا عقیدہ سنیے

جس کا بدلا ہے یہ، وہ بدر کے مقتول ہوئے
آج ہوتے تو مجھے داد غضب کی ملتی
ملک گیری کی ہوس تھی یہ بنی ہاشم کی
وحی آئی، نہ فرشتہ کبھی آیا کوئی
چین بے ان کو ستائے ہوئے میں کیا لیتا
نسلِ عتبہ سے نہ ہوتا جو نہ بدلا لیتا

اس منحرفِ دینِ اسلام کی یہ گفتگو سن کر حضرت زینبؑ کو غصہ آگیا اور انھوں نے فرمایا۔

لائق حمد ہے، جس نے ہمیں عزت بخشی | کیا بتدریج فضیلت پہ فضیلت بخشی
چھانٹ کر ہم میں سے اوّل کو رسالت بخشی | اور آخر کو یہ بالشان شہادت بخشی
ہوں سوا ان کے مراتب، یہ دعا کافی ہے
ہم کو یہ فخر ہے کافی کہ خدا کافی ہے

اے یزید! آج جو آنکھیں ہیں ہماری گریاں | اے یزید! آج جو اٹھتا ہے کلیجے سے دھواں
اے یزید! آج جو ہم قید میں ہیں سرگرداں | اور تو تخت حکومت پہ ہے شاداں فرحاں
اس سے کیا اور ستم و جور و ضلالت والے
تو بڑھا بیٹھ، خدا! گھٹ گئے عزت والے

اے یزید! آج ہے تو خوش کہ ہوئے ہم بے گھر | آسماں اور زمیں تنگ ہیں مظلوموں پر
بج گئی سلطنتِ فسق، رہا کوئی نہ ڈر | ہو نہ مغرور ابھی جامے سے اتنا باہر
یاد کر قول خدا مہلت کافر کے لئے
ڈھیل دی جاتی ہے، گمراہیٔ وافر کے لئے

حق ہے قرآن میں آیا ہے جو قول داور | بے دھڑک ہیں جو کمربستہ بداعمالی پر
ان کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ بانیٔ شر | مضحکہ کرتے ہیں آیات خدا جھٹلا کر
تجھ کو تضحیکِ رسالت میں مزہ آتا ہے
انتقامِ اُحد و بدر پہ اتراتا ہے!

ہاں شریفوں کے کلیجوں کا چبانا کیا خوب | گوشت کو خون شہیداں سے اگانا کیا خوب
دھوم پھر بدر کے بدلے کی مچانا کیا خوب | بھول جانا وہ بزرگوں کا زمانہ کیا خوب
تو بھی گھاٹ ان کے اتر جائیگا جلد کیا ہے؟
ہم سمجھتے ہیں کہ فرمانِ الٰہی کیا ہے

گو زمانے نے کیا ہے مجھے مجبور ایسا | تجھ سے میں بات کروں خیر نہیں کچھ پروا
کیا جواب ایسی خشونت کا، حقارت کے سوا | اور کر ظلم، کہ ہو اور زیادہ رسوا
ہے یہ کے دن، تری ثروت کا زمانہ باقی
حشر تک ذکر ہمارا تو رہے گا باقی

سیرتِ جنابِ امِّ کلثوم

ڈاکٹر صفدر حسین

لث:۔ یہ تو تھی سیرت جناب زینب جن کا ذکر کتب سیر تک میں موجود ہے۔ مگر کچھ اور اسی خانوادہ کی بی بیاں ہیں۔ جن کا ذکر بہت ہی کم مرثیہ گویوں نے کیا ہے۔ انھیں میں امام حسینؑ کی ایک اور بہن جناب امِّ کلثوم تھیں جو بیوہ بھی تھیں اور لاولد بھی۔ ان کے متعلق بھی ڈاکٹر صفدر کے ایک نئے مرثیے سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔ اس سے جناب عباس اور جناب ام کلثوم دونوں کے کرداروں پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ واقعہ جس کا مرثیہ گو نے ذکر کیا ہے وہ شبِ عاشور کا ہے

آگ بجھی ہوئی ہے گرد خیام شہ دیں — چار سو جمع تھے شب خون کے ارادے سے لعیں
بوند پانی کی نہ موجود تھی خیموں میں کہیں — جاں بلب پیاس سے اطفال تھے، بانو غمگیں
مضطرب تھی کوئی قاسم کوئی اکبر کے لئے
ایک بی بی کا عجب حال تھا اصغر کے لئے

سخت تشویش کے عالم میں تھے عباسِ جری — پیش حضرت کبھی پہنچے کبھی زینبؑ کے قریں
نبض کو دیکھ کے عابد کو دعائیں بھی دیں — چوم لی پیار سے ناشاد سکینہؑ کی جبیں
فکر زوجہ کی نہ بچوں کی جدائی کا خیال
وجہ تشویش تھا ہر حال میں بھائی کا خیال

لشکرِ شہ میں بھی لے کے یہ پہنچے پیغام — کہ طلب گار ہیں اک رات کی مہلت کے امامؑ
کیا ہو شب بھر کو اٹھا دو جو شقاوت کے یہ دام — ہم کو اوراد و وظائف کے علاوہ نہیں کام
دل ہوں یکسو تو عبادت کا سر انجام کریں
سجدۂ شکر پر اس ذلیت کا اتمام کریں

صاعقہ بن کے گئے۔ آپ جو تیغہ کھڑکا — اشک بھر لائے جو بچہ کوئی بے جان ہوا
کسی خیمے سے اگر آ گئی رونے کی صدا — مضطرب ہو کے چلا بازوئے شاہ دوسرا
آ کے کلثوم کے خیمے میں قیامت دیکھی
ضبط مشکل تھا وہ ہمشیر کی حالت دیکھی

روبہ قبلہ تھیں مصلّے پہ جناب کلثومؑ   رو کے کہتی تھیں کہ مولا ئے قادر و حی القیوم
گھر گئے ہیں عجب آفت میں امام مظلومؑ   مصلحت تیری کہ اولاد سے ہیں ہم محروم

کیا کروں نذر کہ ہدیہ نہیں رکھتی کوئی
دل ہے مجبور کہ فدیہ نہیں رکھتی کوئی

صبح جل جائے گا سب خاک میں آباد یہ گھر   لال مسلم کے نہ کل ہوں گے نہ زینبؑ کے پسر
ٹکڑے ہو جائے گا گلزارِ جنابِ شبّر   چھد کے رہ جائے گا میدان میں اکبرؑ کا جگر

بھائی بھی آمادہ ہیں تشنہ ہے کی قربانی پر
رحم کر رحم! مری بے سر و سامانی پر

یہ داغ کسے جا کے دکھاؤں اپنا   تو ہی ہمدرد ہے، غم تجھ کو سناؤں اپنا
کس کو قربان کروں، کس کو بناؤں اپنا   کیسے ہم جنسوں میں اعزاز بڑھاؤں اپنا

دستگیری ہو پیمبرؐ کے وصی کا صدقہ
رحم کلثومؑ پہ کر اپنے نبیؐ کا صدقہ

گوشِ عباسؑ میں پہنچی جو یہ پُر درد صدا   حال بتائی ہمشیر پہ دل بھر آیا
سر جھکا کر عجب اندازِ سماجت سے کہا   آپ کے جذبۂ ایثار پہ عباسؑ فدا

کام آ جائے تو یہ خستہ جگر حاضر ہے
فدیۂ راہِ خدا سمجھئے سر حاضر ہے

یہ سخن سُن کے بہن چپ ہوئی، چہرہ چمکا   غم و اندوہ کا اُڑا ہوا دریا ٹھہرا
عجب انداز تشکر سے نگاہوں نے کہا   میرے بھیا یہ بہن تیری شہادت پہ فدا

یہ دعا ہے کہ خدا تجھ کو برومند رکھے
سایۂ حضرتِ شبیرؑ میں خورسند رکھے

امام ششم کی سیرت

فراست بدایونی

میر فصیح سے حضرت علی ابن الحسینؑ کی سیرت کا ایک ہلکا خاکہ اوصاف اولیاء اللہ کے بیان کے سلسلے میں سن چکے ہیں اب فراست سے امام جعفر صادقؑ کی سیرت

کے سلسلے میں دو واقعات سنیے:۔

راضی قضا پہ تھا وہ جگر بند مرتضیٰ   کرتا ہے ایک شخص یہ وصفِ شہِ ہدا
بیمار کوئی آپ کا تھا طفلِ مہ لقا   دولت سرا پہ اس کی عیادت کو میں گیا
حضرت کھڑے ہوئے تھے جھکایا میں سلام کو
پایا مگر اداس امامِ انام کو

اندر گئے حضور میں ٹھہرا رہا وہیں   دیکھا یہ واپسی میں کہ غم کا اثر نہیں
میں نے کہا کہ شاد رکھے رب العالمین   شہزادہ خیریت سے ہے اے بادشاہِ دیں
فرمایا وہ مریض جہاں سے گزر گیا
لڑکے کا حال دیکھ کے آیا ہوں مر گیا"

پوچھا کہ "پہلے رنج تھا اب کیوں نہیں ملال   بولے "ہم اہلبیتِ نبیؐ کا یہی ہے حال
غم کا دمِ نزولِ بلا کرتے ہیں خیال   نازل وہ ہو گئی تو کیا شکرِ ذوالجلال
تسلیم کس طرح نہ رضائے کبریا کی ہو
بندے کا دخل کیا جو مشیّت خدا کی ہو

[illegible]ک نقل اور صبر و تحمل پہ ہے گواہ   پایا ملول شہ کو جو راوی نے کی نگاہ
[illegible]وچھا کہ "خیریت تو ہے اے شاہِ دیں پناہ   فرمایا "روکتی تھی بلندی کی میں راہ
تاکید کی تھی خدمے سے نہ ہر گز چڑھا کرے
بالائے بام گھر میں نہ کوئی چڑھا کرے

[illegible]بچے کی پرورش پہ مقرر تھی اک کنیز   میری کنیز ہے، نہ مگر مانا وہ سخن
[illegible]ٹھے پہ چڑھ رہی تھی کہ پہنچا میں فقط   آغوش میں تھا طفل، لرزنے لگا بدن
دیکھا مجھے تو خوف سے گھبرا گئی کنیز
گودی سے طفل چھوٹ گیا، تھرا گئی کنیز

[illegible]تے ہی مر گیا وہ مرا پارۂ جگر   کچھ اس کی موت کا مرے دل پر نہیں اثر
[illegible]نج ہے کہ ڈر گئی وہ مجھ کو دیکھ کر   کیوں میرا اتنا رعب ہوا اس کنیز پر

ظاہر یہ کہہ کے لطف خداداد کر دیا
آواز دی کہ جا تجھے آزاد کر دیا

فراست نے ان دو چھوٹے چھوٹے واقعات کے بیان میں جو سادگی برتی ہے وہ فنکاری کا کمال ہے۔ امام عالی مقام کا راضی بہ رضائے الہی ہونا اور نزول بلا کے بعد شکر الہی فرمانا پہلے حصۂ روایت اور دوسرے میں بچے کی موت کو محض ایک حادثہ قرار دے کر اس کو کوئی اہمیت نہ دینا، بلکہ اس امر پر مغموم ہونا کہ کنیز کے دل پر غیر اللہ کا رعب چھا گیا اور خود ان کی ذات میں کوئی ایسا نقص اور کوئی ایسی کمی پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے وہ ڈر گئی اور خود اپنے نفس کو مورد الزام قرار دے کر کنیز کو آزادی کی نعمت سے سرفراز کر دینا، یہ رفعت کردار کی وہ اعلیٰ ترین منزل ہے جس پر صرف انبیاء و اولیاء و اوصیاء و ائمہ اطہار ہی فائز ہو سکتے ہیں۔ اردو مرثیوں میں ایسی عالی و سیرت و کردار کے اشخاص آپ کو اکثر نظر آئیں گے۔ ہاں مطالعہ شرط ہے۔

اردو مرثیوں میں مختلف طرح کے مناظر

صبح عاشور

سید انور حسین آرزو لکھنوی

میر انیس اور مرزا دبیر جیسے کاملین فن نے صبح عاشورہ محرم کی بڑی بڑی دل آویز منظر کشیاں کی ہیں ان کے اخلاف اور متبعیں نے بھی اس خوبی صبح کی مرقع کشی میں طرح طرح کے گل کھلائے ہیں۔ ان کے پڑھنے سے ایک طرح کی انبساطی کیفیت محسوس ہونے لگتی ہے اور مرثیہ کی فضا مجروح سی ہونے لگتی ہے۔ مگر حضرت آرزو لکھنوی نے اپنے ایک غیر مطبوعہ مرثیہ میں جو حضرت زینب کے فرزندوں عون و محمدؑ کے حال میں ہے اس عنوان سے صبح عاشور کی منظر نگاری کی ہے کہ پوری فضا ثائیت کے رنگ میں ڈوب گئی ہے اور مرثیت پورے طور پر چھائی رہتی ہے۔ حسن بیان اور تشبیہات و استعارات کا نادر استعمال اسے ایک ایسا ادب پارہ بنا دیتی ہے جس پر اردو شاعری ہمیشہ فخر کر سکتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

جب ہوا روز دہم چاک گریبان سحر ہائے ہائے لگے ہر نخل پہ مرغان سحر
خط ابیض سے نمودار ہوئی شان سحر خون سے جا کے ملا گوشۂ دامان سحر
گل خورشید نے مشرق سے زر افشانی کی
زندگی ختم ہوئی شمع شبستانی کی

صبح کا ہوتا ہے کیا خلق میں دلکش منظر صبح عاشور مگر تھی عجب آفت کی سحر
فق تھا بیمار کے چہرے کی طرح رنگ قمر جھلملاتی ہوئی شمعیں تھیں فلک پر اختر
فرق تھا کچھ آئین جہانداری میں
سرخ تھا سوگ نشیں خیمۂ زنگاری میں

تھی بہارِ گل و ریحان سے عیاں شانِ خزاں
ہوتے تھے مثلِ چراغِ سحری گل خنداں
تھی نسیم اکھڑی ہوئی سانس کے مانند رواں
پھول سے بو کا نکلنا تھا فراقِ تن و جاں
تھا تغیر جدھر آتی تھیں نگاہیں مڑ کر
بے ثباتی کی خبر دیتا تھا رنگ اڑ اڑ کر

تھی گلوں پر جو اداسی تو چمن بے رونق
نظر آتا تھا فلک پر رخِ مہتاب بھی فق
وا تھا دروازۂ گلشن بھی کلیجہ کے شق
ایک اک برگِ شجر دفترِ غم کا تھا ورق
رشتۂ خام تھا تارِ رگِ جاں بلبل کا
کھل کے ابتر ہوا شیرازہ کتابِ گل کا

نقشِ بے درد کی تصویر تھے ہر لبِ جو
آبشاروں سے برستے تھے برابر آنسو
زرد تھی نرگسِ شہلا کی بھی چشمِ جادو
سنبل استادہ تھا اک سمت کشادہ گیسو
ہر کلی دل کی طرح رنج سے بے حال ہوئی
دم بخود رہنے سے سوسن کی زباں لال ہوئی

غنچے کھلنے کے عوض ہو رہے تھے پژمردہ
خاطرِ بلبلِ ناشاد بھی تھی افسردہ
برگ افتادہ تھے یا فوجِ ہزیمت خوردہ
دیکھ کر سوئے چمن ہوتا تھا دل آزردہ
لاش بے گور تھے اشجارِ فتادہ گویا
ہر روش تھی عدم آباد کا جادہ گویا

پیہم آتی تھی تھپیڑوں سے ہوا کے یہ صدا
گل ہوا چاہتی ہے شمعِ مزارِ زہرا
موجِ صرصر کی کشاکش تھی کچھ آرے سے سوا
جو شجر جھک کے اٹھا شاخ گری ہو کے جدا
نخلِ تازہ تھے خزاں دیدہ شجر کی صورت
تند جھونکے تھے ہواؤں کے تبر کی صورت

سر اٹھائے ہوئے پانی پہ یہ کہتے تھے حباب
زیست پیاسوں کی زمانہ میں ہے نقش بر آب
غم کا طوفان تھا کہ آتے تھے پیاپے سیلاب
دیتا تھا قیدِ مصیبت کی خبر ہر گرداب
الم و درد تھا ہر رنگ کی تصویروں میں
غل تھا نالوں کا بپا موجوں کی زنجیروں میں

نوحہ کرتے تھے جو مرغان خوش الحان باہم
آتی تھیں ہائے حسیناؑ کی صدائیں پیہم

طوق پہنے ہوئے قمری بھی یہی بھرتی تھی دم
ہے گلوگیر یہاں عابدؑ بیمار کا غم

ہوا صد چاک ہر اک گل کا امیرانہ لباس
فاختہ پہنے تھی ماتم میں قبائے اندلباس

میر تعشق

ب:- میر انیس نے جس جس طرح روز عاشور کی گرمی کی شدت بیان کی ہے اس سے سبھی عام طور پر واقف ہیں، میر تعشق نے بھی اس دن کی گرمی اور شدت حرارت آفتاب میں امام کی پیاس اور اسے صبر و شکر ہی سے نہیں، بلکہ شادمانی و فرحناکی سے برداشت کرنے کا مقام ایوبی ایک مرثیہ میں بیان کیا ہے:- ملاحظہ ہو:-

اٹھتے ہیں رہ کے جو پردہ اسرار درمیان
معشوق کے حضور ہے عاشق کا امتحان

وہ دھوپ اور پیاس کی شدت کہ الاماں
حضرت کھڑے ہوئے ہیں فرحناک و شادماں

کیا شوق ہے وصال کی شب کا جناب کو
رہ رہ کے آپ دیکھتے ہیں آفتاب کو

ایوب کا ہے فخر، دو عالم کا بادشاہ
کچھ پیاس کا ہے ذکر نہ دریا پہ ہے نگاہ

گرمی وہ پڑ رہی ہے کہ اللہ کی پناہ
ہے دشت کی سموم دھوئیں کی طرح سیاہ

ہے دھوپ کو فلک سے گلہ اپنے بخت کا
باقی نہیں ذرا کہیں سایہ درخت کا

بالکل پڑے ہیں خشک کنوئیں تھے جہاں جہاں
کوسوں نہیں پرند بھلا آدمی کہاں

مارا ہے لو نے جو کوئی نکلا ہے کارواں
شعلے کی ہے زمین، دھوئیں کا ہے آسماں

ٹھنڈک کہیں نہیں ہے ہوا بے حواس ہے
دریا ہوئے ہیں خشک زمیں کو یہ پیاس ہے

عریاں کھڑے ہوئے ہیں عجب حال سے شجر
پھینکی قبائے برگ بدن سے اتار کر

مٹی پہ سر پٹکتے ہیں گر کر گل و ثمر
چلا رہے ہیں برگ خزاں بھی ادھر ادھر

چلنے پہ قافلے ہیں گلوں کے تلے ہوئے
شوق ہوا میں بند قبا ہیں کھلے ہوئے

کوسوں نہ کھیت ہیں نہ کہیں سبزہ ہے نہال — کھا کھا کے دھوپ کوہ بھی پتھر ہوئے ہیں لال
چھپ چھپ کے بیٹھتے ہیں چراگاہ میں غزال — جھیلوں میں ہیں پڑے ہوئے طائر کشادہ بال
گرمی سے ہیں ترائی میں بھی دل جلے ہوئے
بیٹھے ہیں شیر خاک پہ سینے دھرے ہوئے

ہر بحر پر ہے آگ کے دریا کا اشتباہ — جنگل یہ جل رہا ہے کہ ہیں حباب نور شباہ
نہریں پڑی ہیں خشک ہیں ندیاں نہ چاہ — پانی چھپا ہے دھوپ کی شدت سے زیر کاہ
سب زندگی سے مردم آبی کو یاس ہے
موجوں کی اینٹھی ہیں زبانیں یہ پیاس ہے

خیمے پڑے ہیں اہل ستم کے کنار جو — منہ ہاتھ دھو رہے ہیں جوانان زشت خو
پر آب چھاگلیں ہیں لبالب ہر اک سبو — ممکن نہیں حسینؑ کو پانی پئے وضو
"چلئے برائے نذر خدا سر لیے ہوئے!"
اس فکر میں کھڑے ہیں تیمم کیے ہوئے

خشک سالی اور باراں آج ہم اردو مرثیوں کی وسعت اور تنوع مضامین کی ایک جھلک دکھانے کے لئے ہر دو مناظر اور ملاحظہ فرمائیے۔

مامون رشید عباسی خلیفہ کے عہد میں قحط پڑا۔ ساری زراعتیں اور کل باغ و چمن خشک ہوگئے اس کی کیفیت فراست نے امام ہشتم کے مرثیے میں بیان کی ہے:۔

خشک سالی .... مرجھا گئے درخت، زراعت ہوئی خراب
پانی کی ایک بوند کو مٹی ترستی تھی
فراست گلزار و کوہ و دشت پہ حسرت برستی تھی

غنچے تھے شاخسار پہ مانند خار خشک — پھیکا تھا رنگ، زرد ہوئے سبزہ زار خشک
جھیلیں بھری تھیں خاک سے، ہر آبشار خشک — چشمے تھے صورت دہن روزہ دار خشک

پانی شجر جو مانگتے تھے لاکھ چاہ سے
سوکھا جواب ملتا تھا بختِ سیاہ سے

گرد اڑنے پر تھا دودِ جگر کا گمان صاف — کہتے تھے برگ ہو نہیں سکتی زبان صاف
بربادیٔ زمین کے عیاں تھے نشان صاف — معدوم ابر، گرم ہوا، آسمان صاف
برسا رہی تھی آگ کرن آفتاب کی
ہر دم تھی طائروں میں پکار آب آب کی

نام ابر کا چمن میں نہ تھا برق کا نشاں — چمکیں اگر تو آہِ عنادل کی بجلیاں
پانی کا تھا یہ قحط گلستاں میں الاماں — آنسو نہ نکلے بلبلیں کرتی رہیں فغاں
پژمردہ نونہال، ریاحین باغ خشک
غنچوں کے دل تھے خشک گلوں کے دماغ خشک

مامون الرشید نے امام رضا سے کہا کہ "لوگ طعنے دیتے ہیں کہ چونکہ میں نے اس سال آپ کو اپنا ولی عہد بنایا ہے، اس لئے ملک پر یہ بلا نازل ہوئی ہے۔" ع

آپس میں ذکر ہے نہ مبارک ہوا یہ سال

اس لئے آپ خدا سے بارانِ رحمت کی دعا فرمائیں۔

بارانِ رحمت

امام مع خلیفۂ عباسی اور درباریوں کے ایک صحرا میں تشریف لے گئے اور آپ نے بارش کے لئے دستِ دعا بلند کیا۔

مشغول تھے دعا میں ابھی شاہِ ارجمند — جو پارہ ہائے ابر ہوا پر ہوئے بلند
آہو کی طرح بھرنے لگیں بجلیاں زقند — چشمک تھی ان کی چشمِ فسوں ساز کو پسند
بڑھتا گیا سرور وہ ٹھنڈک ہوا کو تھی
کالی گھٹا کے پردے میں رحمت خدا کی تھی

لشکر وہ ابر کا وہ نقیبانہ بانگِ رعد — کالی گھٹا پہ صدقے ہو لیلائے نجد کی جعد
دو ساعتیں گزر گئیں آپہنچا وقتِ سعد — گھر گھر بنائے عیش و طرب حسرتوں کے بعد
کرتی تھی خلق خالقِ ارض و سما کا شکر
جاری زباں پہ آب، زباں پر خدا کا شکر

رستے خوشی کے وادیٔ پُر خار میں کھُلے — انبار خاک کے جو لگے پہلے تھے گلے
مرغابیوں کے وہ طرب انگیز غلغلے — ٹوٹے پھپھولے دل کے اُٹھے اتنے بلبلے
بھاگی بلا، حبابوں کا لشکر جو ڈٹ گیا
غم کا پہاڑ موجوں کی تیغوں سے کٹ گیا

جل تھل وہ دشت کے، برکت جن میں تھی بھری — مٹی میں جان آگئی، کھیتی ہوئی ہری
وہ زینتِ زمین، وہ نباتات کی تری — تھا سلسلہ نشاط کا چرخِ اخضری
رخصت یہ پانی کوہ کی راہوں پہ چڑھ گئے
دریا چھلک چھلک کے نگاہوں پہ چڑھ گئے

پر آب تنگ کوچے تھے، راہ کشادہ پر — کہسار و شہر و دشت کا ہر ایک جادہ تر
ہر گل تھا مثلِ ساغرِ لبریز بادہ تر — بارش کی تھی بہار چمن میں زیادہ تر
حوض لطیف سینۂ بے کینہ بن گئے
تنکے گرے تو جوہرِ آئینہ بن گئے

میلے لباس شاخوں کے باراں نے دھو دیئے — پتّے جو خشک تھے پئے زمی بھگو دیئے
قطروں نے تخمِ نور خیاباں میں بو دیئے — سنبل کی بانکی زلف میں موتی پرو دیئے
باچھیں کھلیں جو مژدۂ فضلِ خدا دیا
نہلا دھلا کے لالے کو دولھا بنا دیا

کی قمریوں پہ موسمِ گل نے نگاہ شوق — پھولوں کے ہار بن گئے گردن میں جو طوق تھے
انگڑائیاں وہ سرو کی وہ میکشی کا ذوق — تھامے بھرے ہوئے، خمِ صہبا پہ خنکو فوق
پیاسی زمین قلزمِ رحمت سے جھک گئی
خشکی پر اپنی سرد ہوا خود بھڑک گئی

ذروں کی آنکھیں دیکھتی تھیں شانِ کردگار — حیراں تھا صحنِ باغ میں بیٹھا ہوا غبار
کیا نہروں کی امنگ تھی، کیا جوشِ آبشار — فوارے مست، اٹھتی جوانی کی وہ بہار
تھی دھوم دو عالم اور چمن کی فضا کا ہے
جو کچھ ہے، سب یہ رنگ دعائے رضاؑ کا ہے

جھنگا صاحب حسینؔ

(د) سردی:- عترتِ اطہار کا لٹا ہوا قافلہ جب کوفہ سے دمشق جا رہا تھا تو ایک مقام پر سخت سردی پڑی۔ اس کی منظر کشی جناب فراست نے بھی کی ہے۔ لیکن ان کے مرثیوں سے اقتباسات پیش کئے جا چکے۔ اب ایک اور مقام کی سردی کا حال جھنگا صاحب حسینؔ سے سنیئے:-

برف باری سے بیاباں کا ہے سبزہ پامال پالا کھانے سے ہیں ٹھٹھرے ہوئے جنگل میں نہال
اوس میں بھیگ کے شبنم کا بُرا ہے احوال پھل ہے جو باغ میں اس پہ ہے بھی فالج کا خیال

گر لبِ نہر کھائیں ہوا واں کی تو ہوں تن نیلے
آج تک ہیں اسی دن سے لبِ سوسن نیلے

جامِ بلور بعینہ ہوا ہر ایک حباب مچھلیاں پانی کے جمنے سے پھنسی تھیں تہِ آب
ہیں شکنجے میں تو جنبش نہیں کھاتے گرداب دانت بجتے ہیں گہر کے، نہیں سردی کو جو تاب

جو حباب آب میں ہے غنچۂ سربستہ ہے
اس پہ کیا آج تلک آب گہر بستہ ہے

برف اس حد کی گری ہے کہ وہ صحرا ہے سفید کوہ اسود تھا جو پہلے وہی سارا ہے سفید
منزلوں دیکھئے میدان میں سبزہ ہے سفید سنگِ مرمر کی طرح سامنے دریا ہے سفید

پانی جمنے سے سمندر میں کہاں جوش ہے آج
جو شجر بن میں ہے گویا کفن پوش ہے آج

نیلے سردی سے ہوئے جاتے ہیں جو تھے گلِ لال برف باری سے ہیں سب باغ میں سیلیں پامال
ہیں سفید آج کے دن سنبلِ پیچاں کے بھی بال بس ہو تو دھوپ کی چادر میں لپٹ جائیں نہال

آہ بلبل سے کلیجے کی رگیں ٹوٹی ہیں
کونپلیں خوف سے سردی کے نہیں پھوٹی ہیں

قمریاں سرو پہ جاتی ہیں نہ بلبل سوئے گل کونپلیں جا کے چھپی ہیں تہِ زلفِ سنبل
کرۂ نار بھی اب حار نہیں ہے بالکل مشعلِ مہرِ درخشاں بھی ہوئی اس سے ہے گل

سرد وہ دھوپ کی چادر ہے کہ جلتی ہی نہیں
آگ پتھر سے نکالو تو نکلتی ہی نہیں؟

جانور جان سے بیزار نظر آتے ہیں   برف کے دشت میں انبار نظر آتے ہیں
طرفہ دنیا کے کچھ آثار نظر آتے ہیں   یعنی بلّور کے اشجار نظر آتے ہیں
بلبلیں باغ میں بیکار ہی اب روتی ہیں
برگ بیری کے جو ٹکڑے ہیں تو گل ہوتی ہیں

ایسی سردی میں چلے جاتے ہیں سلطان ہدیٰ   وہ ہوا سرد، وہ آشوب وہ پٹ پڑ صحرا
جسم سُن ہو گئے ایسا ہے یہ شدت جاڑا   تیر کی طرح سے آتا ہے ہوا کا جھونکا
آج کل بارش شبنم سے زمیں گیلی ہے
ہے برودت کی یہ حد جلد فلک نیلی ہے

راہواروں کی بھی سردی سے ہے اب کم رفتار   وہ بھی مضطر ہیں بلندی پہ جو ہیں ناقہ سوار
زرہیں بھیگی ہوئی ہیں، برف ہوئے ہیں ہتھیار   اینٹھتی ہیں تو کڑکتی ہیں کمانیں ہر بار
جوہر تیغ گلابی ہوں تو دھانی ہو جائیں
تیر ترکش سے نکل آئیں تو پانی ہو جائیں

اٹھ نہیں سکتے ہیں سردی سے پیادوں کے قدم   تھرتھراتی ہیں سنانوں کا ہے اب یہ عالم
لپٹے جاتے ہیں پھریروں کی رداؤں میں علم   برف کے مارے تیغیں بھی ہوئی ہیں سب خم
لہر آتی نہیں ہے آب میں تلواروں کی
باگیں اینٹھی ہوئی ہیں بھیگ کے راہواروں کی

تیز ایسی ہے ہوا جس سے لرزتے ہیں جگر   دست و بازو ہوں تو پھر چل سکیں مرکب کیونکر
مہر بھی چرخ پہ اوڑھے ہے گھٹا کی چادر   خشک ہوتی ہی نہیں یوں ہے زمیں برف سے تر
نیچے مضطر ہیں تو ہیں تہ بھی پریشانی میں
جو عماری ہے وہ ڈوبی ہوئی ہے پانی میں

فردوس بریں ہے یا (۱) عقد علیؑ و فاطمہؑ کا جنت میں جشن

سرفراز لکھنوی

آئیے اب ذرا چلتے چلتے جنت کی بھی سیر کر لیجئے۔ پہلا منظر تو عقد علیؑ و فاطمہؑ سے تعلق ہے۔ جگر گوشۂ رسول کے مسعود مبارک نکاح کے موقع پر

جس طرح زیرِ آسمان خوشی منائی گئی اسی طرح بالائے فلک بھی جشن منایا گیا۔ حریمِ حق سے ندا آئی کہ ہم نے اپنے خاص بندوں علیؑ و فاطمہؑ کا عقد پڑھ دیا۔ اب سارے ساکنانِ جنت جشن برپا کریں اور خوشیاں منائیں۔

صدا یہ سن کے ہے سکانِ خلد کا دل شاد — چہار سمت بپے ہنگامۂ مبارک باد
خوشی سے جھومتے ہیں قدسیانِ پاک نژاد — نشاط حوروں کو فردوس میں ہے حد سے زیاد
جناں کی نہروں میں فوارے ساتھ چھٹتے ہیں
ہر اک روش پہ نچھاور کے پھول لٹتے ہیں

وہ حوریں اور وہ ان کے قدوں کی رعنائی — وہ سارے سارے لباس اور ان کی زیبائی
وہ جل کے ابروؤں کی دلبری و دل آرائی — کسی جبیں نے گویا کہ لی ہے انگڑائی
وہ حسن طوق کا زینت وہ گوشواروں کی
وہ ماہ رُخ کی ضیا وہ چمک ستاروں کی

نکل کے قصروں سے طوبیٰ کے سایہ میں آنا — وہ سینہ تان کے چلنا وہ ان کا اٹھلانا
وہ ہاتھ ڈالے گلوں میں ادھر اُدھر جانا — وہ دیکھ دیکھ کے آئینہ وار اترانا
ادھر کو حوروں کا مجمع اُدھر کو غلماں کا
سماں ہے گلشنِ فردوس میں پرستاں کا

لباس نور کے پہنے ہوئے ہیں سب غلماں — لٹاتے ہیں در و لعل خازنانِ جناں
لیا ہے جشن کا حورانِ خلد نے ساماں — چُنی ہے چاند سے ماتھوں پہ زر کی وہ افشاں
خجل ہو جن سے کواکب کی ضو وہ گہنے ہیں
نکھر کے چمپئی جوڑے سبھوں نے پہنے ہیں

بیاں کیا ہو صفت انکے حسن کی پوری — وہ لال ڈورے وہ آنکھیں ہر اک کی مخموری
وہ رنگ ساعد و بازو کا اُن کے بلوری — وہ ساق پا کہ خجل جس سے شمع کافوری
وہ لب کہ دیکھ کے رنگت ہو زرد سوسن کی
ہنسے تو کھل گئیں کلیاں ہوائے گلشن کی

کرشمے آنکھوں کے سفاک جیتوں میں قتال | وہ گوری چوٹیاں ان کی وہ لمبے لمبے بال
وہ حسن سیب ذقن کا وہ گورے گورے گال | ملے فرشتوں کے دل اس بلا کی پیاری چال

وہ غمزے حشر بپا جن سے پارساؤں کے
لگاوٹوں کی نظر بانکپن اداؤں کے

وہ مانگیں کاہکشاں سی، وہ آنکھ کا کاجل | سروں پہ اڑتے ہوئے وہ حباب سے آنچل
وہ رنگ باہوں کا شرمندہ جس سے ہو صندل | وہ گردنوں کا بہا صفی اور وہ کلکوں کا بل

لچک کمر کی غضب گردشوں میں ڈھائی ہے
کہ بجلیاں دل عشاق پر گراتی ہے

ملائکہ میں ہے غل ہر طرف کہ صلِّ علیٰ | سوا علیؑ کے یہ رتبہ کسے جہاں میں ملا!
نبی سے چل کے کہو اے رسول ہر دو سرا | مبارک آپ کو تزویج حیدرؑ و زہراؑ

نہ شادیاں کبھی ایسی ہوئیں نہ بیاہ ہوئے
خدا نے عقد پڑھا، انبیاء گواہ ہوئے!

شب معراج استقبال رسولؐ

مہذب لکھنوی

(۲-۷) کئی مرثیہ گویوں نے معراج رسول مقبول بیان کی ہے یہاں جناب مہذب لکھنوی سے ان کے مرثیے "جہاں میں عاشق صادق ملال سہتے ہیں" میں حضرت نبی اکرمؐ کے جنت میں استقبال کا سماں سنیئے:۔

رسول آتے ہیں" ہر سو جناں میں ہے یہ پکار | ہے آنکھ نرگس شہلا کی طالب دیدار
لئے ہیں اہل جناں کشتیوں میں پھولوں کے ہار | نبی کی یاد میں پڑھتے ہیں دمبدم اشعار

کبھی ادھر کبھی اس سمت بڑھ گئیں حوریں
رہی نہ تاب تو کوٹھوں پہ چڑھ گئیں حوریں

یہ باتیں کرتی ہیں "ہر سو نہ اب ذرا دیکھو | مراد جس سے بر آئے وہ راستا دیکھو
پروں کی آتی ہے جبرئیل کی ہوا دیکھو | جناں کا آج ہے عالم ہی دوسرا دیکھو

خوشی میں بڑھتی ہیں، بلبلیں یہ بیقراری ہے
قریبِ گلشنِ فردوس کے سواری ہے

گئیں یہ کہتے ہی قصروں میں حوریں سب یکسر — "صبا حضور کے آنے کی دے رہی ہے خبر
خدا کے واسطے پہنو لباس نو، پُر زر — خوشی ہے عید سے بڑھ کے جڑاؤ ہو زیور
دعا کرو کہ یہی موسم بہار رہے
نبی کی دید سے دل کو سدا قرار رہے"

بدل کے حوروں نے حُلّے پہن لیے زیور — نکل کے غرفوں سے باہر کھڑی ہوئیں یکسر
دلوں میں حسرتِ دیدار یادِ پیغمبرؐ — سواری آنے کی پائی تھی جس طرف سے خبر
دل و جگر پہ جدائی کا تیر کھائے ہوئے
ادھر کو دیکھتی تھیں سب نظر جمائے ہوئے

بہت زمانے سے حوروں کو تھا ملالِ فراق — ہوا تھا ہجرِ رسولِ خدا دلوں کو شاق
یکایک اب کی اٹھائے جو دیدۂ مشتاق — سواری آئی نظر، بولیں "آ رہا ہے بُراق
جلو میں اڑتے ہوئے جبرئیلؑ آتے ہیں
وہ نور ہے، وہ رسولِ جلیل آتے ہیں

تھا اک زمانے سے حوروں کو انتظار بڑھیں — دلوں میں شوقِ زیارت تھا، بیقرار بڑھیں
ریاضِ خلد میں مانندِ آبشار بڑھیں — کبھی حیا سے تھمیں، گاہ شرمسار بڑھیں
رکیں تو حد پہ پہنچتے ہی، نمو کی طرح
بڑھیں تو آلِ محمدؐ کی آبرو کی طرح

خوشی میں دید کی حوریں کھڑی ہوئیں یکسر — مسرّت ایسی ہوئی، تھم گیا دلِ مضطر
جو پہنچے خلد میں محبوبِ داورِ محشر — پکاریں دل میں کہ یہ حوریں، وہ آئے پیغمبرؐ
عناں پہ ہاتھ رسالت مآب ڈالے ہیں
رکاب حاملِ وحیِ خدا سنبھالے ہیں

پکاریں، دیر سے مشتاق ہے دلِ بیتاب — دکھائیے ہمیں صورت، اٹھائیے تو حجاب
کہا جو حوروں نے منت سے ہنس دیے وہ جناب — ہٹائی حسن نے بڑھکر رُخِ نبی سے نقاب

حضور نے نظرِ لطف سے جو کام لیا
وہ نور حوروں نے دیکھا کہ دل کو تھام لیا

شہدائے کربلا کے جنت میں استقبال کا اہتمام

آرزو لکھنوی

۴۳۔ آرزو لکھنوی سے شہدائے کربلا کے استقبال کے لیے ساکنانِ فردوس نے کیا کیا اہتمام کیے، ان کا بیان سنیے بے اختیار جی چاہنے لگتا ہے کہ کاش ہم بھی انھیں میں شامل ہوتے!

وہ حشم فوجِ خدا کا وہ جوانوں کی نمود | نورِ رخسار سے وہ مہر فلک سے افزود
دیکھ کر حسنِ ملک پڑھتے تھے گردوں پہ درود | شور جنت میں یہ تھا آج ہے پیاسوں کا ورود
تھی نظر باغ سے رضواں کی بھی جنگل کی طرف
موجیں کوثر کی بڑھی آتی تھیں مقتل کی طرف

چہرے غرفے سے لگائے نگراں تھیں حوریں | ان حسینوں کی جدائی میں تپاں تھیں حوریں
جمع تھیں چند یہاں، چند وہاں تھیں حوریں | محوِ دیدار تھیں القصہ جہاں تھیں حوریں
بجلیاں حسن کی باہم جو چمک جاتی تھیں
آنکھیں ان سب کی دریچوں میں جھپک جاتی تھیں

منتظر چار طرف دوڑتی پھرتی تھی صبا | فرش پہلے ہی سے سبزے نے بچھا رکھا تھا
آنکھیں نرگس کی بھی تھیں حسرتِ دیدار میں وا | پئے تعظیم کھڑا تھا ہر نخلِ چمن استادا
کم نظر آتا تھا سرخی میں لہو پھولوں سے
پیشوائی کے لیے نکلی تھی لو پھولوں سے

پھول کچھ شاخوں میں کچھ ڈالیوں پر تھے میوے | ذائقے میں وہ بہ از شہد و شکر تھے میوے
جس طرف نہریں تھیں کثرت سے ادھر تھے میوے | جھکے پڑتے تھے وہ جو تازہ و تر تھے میوے
دل میں فاقوں کے جو مہمانوں کے غم کھاتی تھیں
ڈالیاں شوق میں ہر بار جھکی آتی تھیں

باغ سر سبز تھے آراستہ تھے قصر تمام
آ کے تا پائیں تھکے ماندے مسافر آرام
بسکہ تھے نرغۂ اعدا میں شہ عرش مقام
گھر میں خاتون قیامت کے بپا تھا کہرام
غم سے بیٹھیں تھیں آسیہ و مریم و سارا بیتاب
دل سنبھالے ہوئے بیٹھیں تھیں فاطمہ زہرا بیتاب

منتظر شیر خدا بیٹھے تھے کوثر کے قریب
حمزہ و جعفر طیار تھے حیدر کے قریب
سبز پوشانِ جناں سب جمع تھے شبر کے قریب
انبیاء کا تھا اک انبوہ پیمبر کے قریب
شور تھا سبط رسول الثقلین آتے ہیں
ہر طرف دھوم مچی تھی کہ حسین آتے ہیں

مصطفیٰ کہتے تھے زہرا کلیجے کیا حال بتاؤ
کہو شبر سے کہ کیا کرتے ہیں دل کو سمجھاؤ
ہیں کدھر ساقیِ کوثر کو مرے پاس بلاؤ
دور سے آئیں گے پہنچو نہ اب دیر لگاؤ
ہوں پیے رفعِ عطش سرد و معطر ساغر
آبِ تسنیم سے بھر رکھو بہتر ساغر

دھوپ میں جلتا ہوا آئے گا شبیر مرا
ہیں نثار اس کے وہ ہوگا مری امت پہ فدا
ہوں گے ہمراہ بھی سب اس کے عزیز و رفقا
پائیں آرام تو سب سایۂ طوبیٰ میں ذرا
معتدل ہو کے نسیم اور صبا چلتی رہے
ہوں گے آلودہ پسینہ میں ہوا چلتی رہے

حلے اِدریس کریں حسبِ مراتب تیار
ہوں گے بوسیدہ شہیدوں کے لباسِ تن زار
کہو رضواں سے مناسب نہیں ویرانی بہار
چمن سے نعماتِ جنان پہلے ہی سے بے تکرار
ایسے مہمانوں کی اور عزت و توقیر نہ ہو
بھوکے دو روز کے آئیں گے کہ تاخیر نہ ہو

جملہ راحت کے ہوں ساماں بہتر کے لئے
قصر الماس بنے دلبر شبیر کے لئے
بہر سایا قوت کے دو ثانیِ جعفر کے لئے
اور ایک چھوٹا سا جھولا علی اصغر کے لئے
جس میں تکلیف ہو ایسا کوئی عنوان نہ ہو
ماں کی آغوش سے چھوٹے گا پریشان نہ ہو

ساقی نامہ میں بہار

پیارے صاحب رشید — پیارے صاحب رشید انیس اور تعشق دونوں خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اُنھوں نے مرثیہ میں پہلی دفعہ ساقی نامہ کا اضافہ کیا۔ چونکہ ہنھوں نے ان کی تقلید کی ہے۔ اس لئے ان کے ایک ساقی نامہ سے چند بند پیش ہیں۔ ساقی نامہ میں بہار آئی ہے۔

پھول کھلنے لگے بلبل کی صدا آنے لگی — کہ نظر باغ کی صحرا میں فضا آنے لگی
غنچے گل ہونے لگے، باد صبا آنے لگی — ٹھنڈی ٹھنڈی لپٹ دریا سے ہوا آنے لگی
بچے ہر مرتبہ آقا کی طرف مڑنے لگے
زلفیں ہلنے لگیں دامان قبا اڑنے لگے

لطف پیدا کیا شبنم نے سوا رو رو کے — غنچے شاداب ہوئے اور بھی تر ہو ہو کے
گیسو آراستہ سنبل نے کئے دھو دھو کے — سب جوانان چمن اٹھنے لگے سو سو کے
پاؤں رکھتی ہے نسیم سحری گن گن کے
اپنے کو دیکھتا ہے سرو ہر اک تن تن کے

پھولوں نے فصل بہار آتے ہی رنگت پائی — زر گل مل گیا گلچیں نے یہ دولت پائی
پانی کے زور سے فواروں نے قوت پائی — دست و پا بیلوں نے پھیلا دیئے راحت پائی
ہے سکوں سب کو ہر اک امر میں آسانی ہے
آئینہ جو کھڑے ہیں، نہریں یا پانی ہے

رنگ لالے کا نیا ہے نئی زیبائی ہے! — تختہ سوسن کا کھلا ہے کہ گھٹا چھائی ہے
سب زلیخا کی جوانی کی روش پائی ہے — ہے سوا حسن چمن جا کے بہار آئی ہے
جس کو سمجھے تھے برا لوگ وہ اچھا نکلا
باغ میں سبزۂ بیگانہ یگانہ نکلا

ہے جوانان چمن کی ہر ادا خوش اسلوب — کیسے خوش رنگ لباس انکے وہ شکلیں مرغوب
بلبلیں باغ میں طالب ہیں تو گل ہیں مطلوب — سایہ شمشاد کا ہے روکش قد محبوب

بدلی آ آکے جو سر بار سرک جاتی ہے
کہیں دھوپ اور کہیں چھاؤں نظر آتی ہے

باغ میں فصلِ بہار آئی کہ ایام شباب
باغباں سے ہوئی خوش لیکے زرِ گل کا حساب
چمن کے واسطے سنبل کو دیا پیچ و تاب
اس طرح سبزے کو روندا کہ ہوا وہ شاداب
ناز دیکھو کہ جدھر بادِ بہار آکے چلی
تو ہر اک غنچے کو ہر پھول کو ٹھکرا کے چلی!

وہ سماں، صبح کا، طاؤس کا کہسار میں شور
تارے چھپنے میں نظر آنے لگے دیدۂ مور
ایسا دکھلا رہی ہے فصلِ بہار اپنا زور
دیکھتے دیکھتے نرگس کی ہوئیں آنکھیں کور
کیفیت ایسی اُدھر ہے کہ اِدھر پھر نہ سکے
پہنچے تو چہرہ
پہ نظر، پھر نہ سکے

اس قدر کثرتِ گل ہے کہ نہیں کوئی حساب
ٹہنی مہندی کی سر اٹھ سکے یہ کرتی ہے خطاب
"میں پسی جاتی ہوں، یہ جان پہ کیسا ہے عذاب"
دمبدم فصلِ بہاری اُسے دیتی ہے جواب
شوق محبوبوں کا ہر دم اسی تدبیر میں ہے
روزِ اوّل ہی سے پسنا تری تقدیر میں ہے

آتشِ گل سے نہیں بلبلوں کو کچھ بھی ضرر
ہے سزاوار اسے بھی کہیں گر آتشِ تر
عشق باعث دل گرمی اسی کا ہے اثر
گل ہر اک شعلے سے بڑھکر ہے، پہ جلتے نہیں پر
عشق کس طرح نہ ہو، کیوں نہ کریں خواہشِ دل
کہ عنادل کے عناصر میں بھی ہے آتشِ گل

قطرے شبنم کے ہر اک سمت ہزاروں ہیں عیاں
ہیں شجر سارے مرصع یہی ہوتا ہے گماں
جوہری آتے ہیں دھوکے میں میانِ بستاں
ابرِ نیساں کا بھلا کون اٹھاتا احساں
کئے ہیں فصلِ بہاری نے یہ جوہر پیدا
کہ درختوں میں بھی ہونے لگے گوہر پیدا

چال ہے بادِ صبا کی کہ ہیں بیتاب شجر
دمبدم لیتی ہے گلزار میں اک اک کی خبر
کبھی اس گل پہ عنایت ہے کبھی اس گل پر
کبھی جاتی ہے ادھر اور کبھی آتی ہے ادھر

شوق میں لوٹتے ہیں برگِ خزاں دیدہ بھی
کروٹیں لے رہا ہے سبزۂ خوابیدہ بھی

شاد عظیم آبادی

(۱) شاد عظیم آبادی رشید کے ہمعصر تھے۔ ان کے مرثیے "اے دستِ فکر کھول مرقع خیال کا" سے بھی ساقی نامہ کا ایک اقتباس لیجئے۔ جس لطف سے ساقی نامہ کو مرثیے سے ربط دیا ہے وہ اعلیٰ فنکاری کا ایک نمونہ ہے:-

ساقی سدا ہو جس سے بصیرت وہ مے پلا | روشن کرے جو چشمِ حقیقت وہ مے پلا
افزوں ہو جس سے نشۂ وحدت وہ مے پلا | دل پر جو وا کرے درِ رحمت وہ مے پلا
ساغر جو ڈگمگا کے پیوں جھومنے لگوں
اٹھ اٹھ کے مے کشوں کے قدم چومنے لگوں

آزاد ہوں کسی سے عداوت مجھے نہ بیر | کرتا ہوں اپنے باغِ مضامین کی آپ سیر
شیشہ ہو، جام ہو، کوئی ان میں نہیں ہے غیر | جو ہیں حریف اپنے قدح کی منائیں خیر
پہلی سی وہ نگاہ نہ پہلے سے طور ہیں
وہ دن گئے زمانے کی آنکھیں اب اور ہیں

ساغر نئے ہیں، جام نیا، میکدہ نیا | شیشے نئے ہیں، دور نئے، منچا نیا
خم میں وہی شراب پرانی، مزا نیا | ہر سمت انجمن میں ہے سامان نیا نیا
اس بزم کی جو شان ہے قائم وہ شان رکھ
اے مستِ شوق کچھ تو بڑھاپے کی آن رکھ

ہو کیف زا، وہ مے مجھے بے اشتباہ دے | قطرہ ہر اک بشارتِ عفوِ گناہ دے
اس دورِ بے پناہ میں دم بھر پناہ دے | تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی نباہ دے
گزرے خمار میں بھی اسی آن بان سے
نکلوں جو میکدہ سے تو مستوں کی شان سے

ہم مشربوں کی چار طرف ہو جمی قطار | ہر ہر قدم درود کے نعرے ہوں بار بار
ہو چار سو ہجومِ حریفانِ مے گسار | حلقے میں اپنے لیں مجھے یارانِ بادہ خوار

گردن میں ہاتھ دوش پہ بسر لٹکے ہوئے
لے جائیں میکدے سے سہارا دیئے ہوئے

آمادۂ وغا ہے خدیو قمر رکاب
زینت فزائے زینِ فرس ہو چکے خباب
رن کا ہے رخ کئے ہوئے اسپِ صبا شتاب
بس بس! چڑھاؤں جام پہ جام اب کسے ہے تاب
گرد تعلقات سے دل دھو کے ہیں چلا
بے جام ہے اک خاکِ قدم ہو کے ہیں چلا

ظلمات

فراست زیدپوری

فراست زیدپوری نے اپنے ایک مرثیہ میں ظلمات کی نقشہ کشی کی ہے امام محمد باقرؑ نے ایک شخص کو اس تاریک ہولناک اور حد درجہ گھنے اندھیرے کی سیر کرائی ہے جو آبِ حیواں کو اپنے آغوش میں چھپائے ہوئے ہے۔ اور جس میں سے گزرنا کسی خضرِ راہ کی رہبری کے بغیر عام انسانی طاقت سے باہر ہے۔ اس مقام کے چند بند ملاحظہ کیجیے۔

وہ تیرگی وہ پردۂ ظلمات ہولناک
ایسا حجاب جو نہ ہو تیغِ نظر سے چاک
ظاہر تھا آسماں، نہ ہویدا تھی سطحِ خاک
باندھی تھی چار سمت سیاہی نے اپنی دھاک
مدھم ہو جس کے سامنے لیلائے شب کا رنگ
بختِ سیاہ قیس کی صورت غضب کا رنگ

اس تیرگی کی دورِ فلک میں نہیں نظیر
ہو سامنا تو شرم سے اڑ جائے رنگِ قیر
ہیبت پکارتی ہے کہ سن لیں جوان و پیر
محشر کی رات ہے اسی پردے میں گوشہ گیر
بہرِ مثال نام نہ لو زنگبار کا
اس کل کا جزو اک ہے اندھیرا مزار کا

ظاہر نہ تھا کہ ہے کوئی صحرا کہ شہر ہے
معلوم کب تھا چاہ کہیں ہے کہ نہر ہے
بندہ نہ ہو جو قائلِ قدرت تو قہر ہے
اس رنگ کا بھی ایک چمن باغِ دہر ہے

دخل خزاں نہ موسم گل کا گزر یہاں
بھولی آفتاب کا بھی نہیں جلوہ گر یہاں
شمعوں کی لو چراغوں کی ضو کا کہاں گزر | چمکا کبھی نہ کرمک شب تاب بھی ادھر
پستی کا علم تھا نہ بلندی کی تھی خبر | دشوار تھا کہ دوڑ سکے راہ میں نظر
ٹھوکر نہ کھائے ڈر تھا یہ ہر اک گام پر
پیکِ خیال رک گیا اپنے مقام پر

جزیرۂ خضرا

قدیم لکھنوی :- میر انیس کے ہوتے قدیم نے اپنے ایک مرثیہ میں جزیرہ خضرا[1] کی نقشہ کشی کی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں بہ عقیدۂ مذہب شیعہ امام آخرالزماں حضرت مہدیؑ کا زمانہ غیبت میں قیام فرما ہیں۔ قدیم قبل کے بند میں امام دوازدھم سے جلد ظہور کرنے کی استدعا کرتے ہیں، پھر جزیرۂ خضرا سے براہِ راست تخاطب ہے۔"

نہ آؤ گھر میں مرے تم اگر نہیں منظور | تمھاری جو ہو خوشی اس میں میں بھی ہوں مسرور
خلاف مصلحتِ وقت ہے، تو کیا ہے ضرور | کبھی اٹھائیو پردہ جب آئے وقت ظہور
کچھ آس دل کو دم اضطراب تو دو گے
میں بھیجتا ہوں عریضہ[2] جواب تو دو گے

---

[1] آخر ۱۹۶۷ء سے ماہرین فلکیات ایک ایسے مقام کی تلاش میں ہیں جہاں سے کچھ ریڈیو جیسی آوازیں آرہی ہیں۔ انھوں نے وہاں کے رہنے والوں کا نام "چھوٹے بڑے آدمی" رکھا ہے۔ کہیں یہی جزیرۂ خضرا والے تو نہیں ہیں۔

[2] خوش عقیدہ مومنین کرام پانزدھم شعبان کی صبح کو، جو تاریخ ولادت امام مہدیؑ کی ہے۔ آپ کی خدمت میں اپنی اپنی درخواستیں گندھے ہوئے آٹے میں رکھ کر لڈو سا بنا کر کسی دریا یا تالاب میں پھینک دیتے ہیں اس کو خاص طور سے عریضہ کہا جاتا ہے۔

جو نکلے گھٹ کے دم لے سرزمینِ کوچۂ یار ہمیں بھی ڈھونڈ دو گز جگہ برائے مزار
نہاں ہیں آنکھوں سے ان کے تو پھولوں کے خار تو ہی جزیرۂ خضرا، دکھا دے اپنی بہار
عیاں یہ نہج میں دریا کے جلوہ تیرا ہے
کہ فرشِ آب پہ معصوم کا مصلا ہے

ہے سطحِ آب پہ تو اے جزیرۂ خضرا کہ معجزے سے ابھرا ہے نقش پانی کا
بھرا ہے کلیوں سے قدرت نے دامنِ دریا ہیں جسمِ آب پہ گلکاریاں یہ صلِّ علیٰ!
ہرا بھرا یہ جزیرہ ہے بحرِ اخضر میں
کہ تیرتی ہے زمرد کی ناؤ کوثر میں

جو بحر پہلے تھا ابیض وہ کیوں ہوا اخضر عجب نہیں ہے یہ نکتہ جو اس میں ہو مضمر
نگاہِ معجزہ پیما جو پڑ گئی اس پر بہار رہ گئی دریا میں منجمد ہو کر
فزوں بہشت سے زینت ہے اس جزیرے کی
اسی بہار سے خلقت ہے اس جزیرے کی

نظر نہ اب بھی اگر واں کا سبزہ زار آیا قسم امام حسنؑ کی میں زہر کھاؤں گا
ہے کب جزیرۂ خضرا کا بحر میں جلوہ پڑا ہے چشمۂ حیواں میں خضر کا بیڑا
چمن ہے ایک جزیرے میں اس قرینے کا
کہ جیسے لوحِ زبرجد پہ کام مینے کا

امامِ عصر کی تفریح گاہ کیا کہنا وہ سرزمین ہری، وہ گیاہ، کیا کہنا
تو رشکِ گلشنِ جنت ہے واہ کیا کہنا بڑھا دیا مرا زورِ نگاہ کیا کہنا
خزاں نہ آئے گی یاں جب تلک خدائی ہے
بہار آبِ بقا میں نہا کے آئی ہے

بلند ایسے ہیں اشجار رشکِ کوہِ طور جو گل کی شاخ سے لکھ دیں فلک پہ سورۂ نور
ہیں ہم صفیرِ کلیم اس چمن کے ہیں جو طیور چہک چہک کے دعا کر رہے ہیں بہرِ ظہور
یہ زمزمے ہیں عنادل کی بھی زبانوں پر
گرا دے برق ہمارے بھی آشیانوں پر

پیے مریضِ محبت ہے یہ شفا کی زمین — سجی ہوئی یہ قدرت کی ہے، خدا کی زمین
ہے کیا جہاں میں کوئی اور اس فضا کی زمین — ندا یہ ہاتفِ غیب آئی "کربلا کی زمین"
قدیم تو تو ہے ساحل پہ بحرِ اخضر کے
سوئے فرات نکل جا تناوری کر کے

وقار میں یہ وہ چشمہ ہے غیرتِ کوثر — ہوائیں دامنِ ساحل کی کھائے جی بھر کر
نہ کیوں ہو دید کے قابل درختوں کا منظر — کہ جیسے کاہکشاں زیرِ گنبدِ اخضر
جو دیکھ لے تو یہ کہہ دے گی خوش مذاق کی آنکھ
یہیں یہ رہ گئی الجھی ہوئی۔ براق کی آنکھ

صفا میں صفتِ اسکندری ہے سارا آب — نہیں شک اس میں کہ قدرت کا ہے سنوارا آب
ہیں بیقرار جو موجیں بنا ہے پارا آب — یہ نہر کہتی ہے "کوثر میں ہے ہمارا آب"
ہے گو وہ خلد میں، میں کربلا کے شہر میں ہوں
مگر انھیں کا ہے وہ بھی، میں جن کے مہر میں ہوں

کہو جزیرۂ خضرا سے میرے پاس آئے — زمین اپنی مرے سبزہ ساحلوں سے ملائے
اگر وہاں سے زیادہ فضا یہاں کی بھائے — تو غیرت نہیں آپس میں کچھ یہیں رہ جائے
یہ گر ہے سبطِ رسالت پناہ کا مسکن
تو وہ حسینؑ کے نورِ نگاہ کا مسکن

نہیں شک اس میں کہ کوثر ہے مرا رتبہ شناس — جو دیکھ لے مجھے بجھ جائے سلسبیل کی پیاس
یہ نخلِ سرو جو ساحل پہ ہے بلند اساس — ہے نصب یہ علمِ سبز حضرت عباسؑ
جو ہے جزیرۂ خضرا مثالِ طوبیٰ سبز
تو یاں ہے عکس فگن نہر میں پھریرا سبز!"

معراج

ط۔

خبیر لکھنوی

خبیر لکھنوی نے اپنے مرثیے "معمورۂ عرفانِ خدا سینہ ہے میرا" میں معراج کی نقش کشی کی ہے۔ دربارِ حبیب میں حاضری کے سلسلے میں محبوبِ الٰہی نے جو قدرت نمائیاں

دیکھی ہیں اور جو مراحل طے کرکے وہ "مقامِ قابَ قوسَین اَوْ اَدنیٰ" کی منزل تک پہنچے ہیں ان کا مرقع ملاحظہ ہو:-

اس شب کا فسانہ ہے حقیقت کا ترانا
فرمانِ الٰہی سے وہ جبریل کا آنا
وہ سرورِ کونین کو آرام میں پانا
وہ پائے ادب چوم کے حضرت کو جگانا
سمجھے ہوئے تھے نازکیٔ خوئے محمدؐ
آنے نہ دیا بل سرِ ابروئے محمدؐ

جبریل کی وہ عرض حضورِ شہِ ذی جود
حضرت کی ملاقات کا مشتاق ہے معبود
ہیں طالبِ دید اہلِ جناں با دلِ خوشنود
لایا ہوں ز جنت زیں آپ سواری بھی ہے موجود
فردوس سے با ساز براق آیا ہوا ہے
مولا کی سواری کو براق آیا ہوا ہے

سنتے ہی کیا شکرِ خدا شاہِ اُمم نے
پر نور کیا دامنِ زیں شمعِ حرم نے
مرکب کے قدم دوشِ ہوا پر لگے جمنے
کہتے تھے ملک چال یہ دیکھی نہیں ہم نے
طے کرتا ہے دم میں فلکِ ہفت طبق کو
وہ قدرتِ حق لے کے چلی رحمتِ حق کو

بالائے فلک پہنچی جو حضرت کی سواری
اس قبلۂ آخر نے کیا سجدۂ باری
آنسو تھے مسرت کے سبب آنکھوں سے جاری
یا تھا جبروتِ صمدی باعثِ زاری
قدسی ہوئے بشاش زیارت کے شرف سے
کی شہ نے ملاقات رسولانِ سلف سے

ہر چرخ کو طے کرتے ہوئے سرورِ ایماں
پہنچے درِ فردوس پہ با خاطرِ شاداں
تھا دیدۂ مشتاق پر اک خلد کا ایواں
خدمت پہ کمر باندھ کے حاضر ہوا رضواں
کی عرض کہ گلزارِ جناں دیکھیے مولا
اللہ کی قدرت کا نشاں دیکھیے مولا

فردوسِ بریں میں جو قدم آپ کے آئیں
آنکھوں کے عوض نور سب آنکھوں کا بچھائیں
حوروں کو خوشی یہ ہو کہ پھولوں نہ سمائیں
حضرت جو بڑھے دینے لگے نخل دعائیں

پڑھ کر صلوٰۃ اور بڑھی شان حق کی
گلدستوں سے آنے لگی آواز اذاں کی

وہ دل میں اترتی ہوئی نرگس کی نگاہیں — وہ زیب سر ناز شگوفوں کی کلاہیں
وہ نغمۂ بلبل سے عیاں عشق کی راہیں — وہ دل سے اثر بن کے نکلتی ہوئی آہیں
جنباں وہ شجر صورت سرشار محبت
پھولوں میں وہ کانٹوں کی جگہ خار محبت

پتوں کی صفائی میں عجب نور کا عالم — ہے آئینہ ناصیہ حور کا عالم
ہر گل میں ہے اک دیدۂ مخمور کا عالم — ہر غنچہ ہے بیدا قمقمہ طور کا عالم
فردوس معلیٰ کے وہ گلشن کی تجلی
ہے آتش گل وادیٔ ایمن کی تجلی

سدرہ کے قریں پہنچا وہ سلطان رسالت — ٹھہرا کے وہ جبریل امیں بھی ہوئے رخصت
کچھ دور رواں اور رہی حق کی محبت — زائل ہوئی مرکب سے بھی رفتار کی طاقت
حاضر وہ پئے خدمت ذی شان ہوا رفرف
اڑتا ہوا فر فر وہ نمایاں ہوا رفرف

وہ عالم لاہوت کے نزدیک گئے شاہ — رف رف سے بھی طے ہو سکی قرب کی وہ راہ
افراط ادب سے ہوا پیدل وہ حق آگاہ — نعلین جدا کرنے کو تھے آپ کہ ناگاہ
آواز سنی وہ یہ نہیں مطلوب الٰہی
موسیٰ تھے محب، آپ ہیں محبوب الٰہی

پہنے ہی بڑھے بادشہ کون و مکاں اور — مہمان ہوا افضل خدائے دو جہاں اور
ہو گئے تھے حجابوں پہ حجابات عیاں اور — ایک پردہ فقط رہ گیا جس کا تھا سماں اور
طے ہوتا رہا راہ میں ہر راز کا پردہ
اٹھا نہ مگر بیچ سے وہ ناز کا پردہ

محبوب خدا رعب خدا سے ہوا مضطر — طاری تھا جلالت کا اثر قلب نبی پر
ہر سو عظمت حق کی نظر آتی تھی یکسر — تسکین کو آواز یہی آئی مکرر

اے میرے ندیم اے مرے محبوب قریب آؤ
اے طالبِ حق اے مرے مطلوب قریب آؤ

بندے کے قریب آیا وہ اللہ کا پیارا — باقی نہ رہا فاصلہ دو ایک کماں کا
قربت جو ہوئی شوق بڑھا اور زیادا — پردہ اُسے کہتے نہیں، ہے نام کا پردا
خلوت میں گوارا نہ ہوا ساتھ کسی کا
تھا مہرِ نبوت پہ مگر ہاتھ کسی کا

اٹھتے ہوئے آپس کے حجابات ذرا دیکھ — یہ شوق یہ اندازِ ملاقات ذرا دیکھ
یہ لطف، یہ خاطر، یہ مدارات ذرا دیکھ — طرزِ سخنِ خالقِ اموات ذرا دیکھ
دیتی ہیں خبر وہ جو ہیں اعجاز کی باتیں
کچھ راز کی باتیں ہوئیں، کچھ ناز کی باتیں

کی عرض پیمبر نے کہ اے قادر و قیوم — مسرور ہوں رحمت سے نہ رکھا مجھے محروم
انجام سے اُمت کے مگر اب بھی ہوں مغموم — آواز یہ آئی کہ تمھیں کیا نہیں معلوم
پرسش نہ کوئی ہوگی مروّت سے تمھاری
بخشوں گا میں اُمت کو شفاعت سے تمھاری!"

روضۂ امام حسینؑ

شدید لکھنوی

ی:۔ آپ جنت سماوی کا منظر تو دیکھ چکے، اب شدید کے قلم سے جنت ارضی یعنی روضۂ امام حسینؑ کی نقشہ کشی ملاحظہ کیجیے:۔

صلوات پڑھ کے قدرتِ غفار دیکھیے — شانِ مزارِ سیّدِ ابرار دیکھیے
یاں ملک ہیں شوکتِ دربار دیکھیے — خود مصطفٰے ہیں طالبِ دیدار دیکھیے
عاصی بھی ہے دخیل تو آمرزگار ہے
روضہ کے گرد رحمتِ رب کا حصار ہے

ادہ ہو کے پشت بہ قبلہ کرو نظر — ہے سامنے مزار شہنشاہ بحر و بر
انب ہے طلا کا اسی سمت جلوہ گر — جھکتا ہے جس کو دیکھ کے از خود ہر ایک کا سر

سجدہ کریں ملک بھی سب اس درجہ نور ہے
آجائے غش کہوں جو اسے کوہِ طور ہے

گنبد سے ٹھیک تا حرم ہیں باشوکت و وقار   مینار دونوں، دونوں طرف کے ہیں استوار
بیرق ہوا سے اڑ رہی ہے بابِ بقیع پر   غافل نظر کرے تو یہ ہوتا ہے آشکار
خواہانِ لطف و رحمتِ ربِ مجید ہے
دستِ دعا اٹھائے ہوئے اک شہید ہے

پہنچا جو کوئی کفش کنی تک بہ فضلِ رب   نعلین اتار دیے یہ پکارا اسے ادب
بولی یہ شان بڑھ کے جھکا اپنے سر کو اب   اتنا نہیں وقوف، تجھے ہے مجھے عجب
واں جلوہ گر جو تھا یہیں اب وہ امام ہے
ہاں وادیٔ مقدس اسی جا کا نام ہے

جب بڑھ کے اذنِ داخلہ حاضر ہوئے بہ ذوق   دل نے کہا حصارِ جناں پر ہے اس کو فوق
گردن میں تھا غلامیٔ شبیر کا جو طوق   چل راہ سر کے بل متقاضی ہوا یہ شوق
جو فخرِ کعبہ ہے اسی گھر تک پہنچ گئے
اک لحظہ بھر میں دوسرے در تک پہنچ گئے

جب کر چکے لوازمِ آداب کے سلام   تعظیماً ایک سجدہ کیا باصد اہتمام
چوکھٹ پہ آنکھیں مل کے لیا بوسہ در کو تھام   بعد اس کے کچھ خبر نہ رہی صبح ہے کہ شام
طاقت جواب پیکرِ زائر کو دے گئی
آخر ضریح تک کششِ عشق لے گئی

کیوں کر بیاں ہو وصفِ ضریحِ شہِ ہدیٰ   دشوار کیا محال ہے ملنا مثال کا
دل ہے کسی ملک کا یہی کہتی ہے صفا   کرسی و عرش سے بھی بزرگی میں ہے سوا
موسیٰ یہ دیکھ دیکھ کے کہتے ہیں نور کو
اس برق نے جلا دیا تھا کوہِ طور کو

~~~
~~~

پانی

راجہ امیر احمد خاں آف محمود آباد

ف:- معرکۂ کربلا میں شامیوں نے جب بڑا ظلم قتل حسینؑ و اصحاب حسینؑ کے قبل کیا وہ یہ کہ ستم گروں نے نہر فرات پر پہرے بٹھا دیئے اور خیمہ ہائے حرم اقدس تک پانی کی ایک بوند نہ پہنچنے دی۔ چھوٹے چھوٹے بچے پیاس سے تڑپتے تھے اور ان کی "العطش العطش!" کی فریاد حسینی سورماؤں کا جگر پانی کئے دیتی تھی۔ ہر جری خود ہی پیاسا تھا۔ لیکن معصوموں کی اس فریاد سے اس کا دل کباب بنا جا رہا تھا۔

راجہ صاحب محمود آباد نے اپنے ایک مرثیے میں اسی "پانی" کی اہمیت بیان کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے کہ مرثیہ سے الگ کر کے یہ کتنی حسین نظم اس موضوع پر تسلیم کی جا سکتی ہے۔

جہاں کے واسطے ہے وجہ زندگی پانی　　ہے چشم عالم ایجاد کی تری پانی
اسی سے مشکل اہل زمین ہوئی پانی　　رگوں میں دہر کے دوڑا کیا یہی پانی
بڑھے ہوئے ہیں اسی سے تاک کے دامن
اسی نے رنگ دیئے صحن خاک کے دامن

اسی سے پائی ہے روح حیات ہستی نے　　چھلک پڑے ہیں اسی سے زمین کے گنجینے
اسی کے دم سے کشادہ بحار کے سینے　　اسی نے نصب کئے ہیں جہاں میں آئینے
زمانہ بھر کے لئے وجہ زندگانی ہے
فلک کی آنکھ کا تارا زمین کا پانی ہے

اسی کی وجہ سے آباد دور دار حیات　　یہی ہو جان حیات اور یہی مدار حیات
اسی سے گلشن ہستی میں ہے بہار حیات　　اسی کے دم سے ہے وابستہ اعتبار حیات
ہے روح ہر متحرک کی اور ساکن کی
صدا سنو تو من الماء کل شیٔ کی

اسی نے چادر خشکی زمین سے چھینی　　اسی کے قطروں میں پنہاں ہے حسن آئینی
ہے اس کی سادگیوں میں غضب کی رنگینی　　اسی نے گل کو سکھائی چمن میں خود بینی

سحاب تر کو برسنا سکھا دیا اُس نے
گلوں کو باغ میں ہنسنا سکھا دیا اس نے

سکھائیں پھولوں کو صحرا نوردیاں اس نے
شمیم گل کو دیں آوارہ گردیاں اس نے
خزاں کے چہرے سے دھوئیں ہیں زردیاں اس نے
لباس باغ پہ کھولی ہیں فردیاں اس نے
گلوں کے بھیس میں قطروں کے ڈھنگ بدلے ہیں
خدا کی شان کہ پانی نے رنگ بدلے ہیں

سبک مثال ہوا اور بھر گرانی ہے
سحاب فیض کی اٹھتی ہوئی جوانی ہے
جمالِ برق کی ہر لحظہ ضو فشانی ہے
خدا کی شان کہ دامن کی آگ پانی ہے
ذرا سی چوٹ پڑی دل کے داغ جلنے لگے
اندھیری رات جو پائی چراغ جلنے لگے

سحاب فیض جو برسا تو بھر دیئے جل تھل
یہ انقلاب، یہ تعمیر اور یہ رد و بدل
یہ ناتوانوں کی قوت ہے دیکھ زورِ عمل
طبق زمین کے اور توڑ دے ہری کونپل
کوئی قوی ہے ضعیفوں کے ساتھ ساتھ ضرور
نمو کے پردے میں پنہاں ہے کوئی ہاتھ ضرور

علم

قائم رضا نسیم (دہلوی) :-
اردو مرثیہ میں مختلف طرح کے مضامین پر بڑی خوبصورت نظمیں بھی ملتی ہیں۔ ایک اور اس طرح کی مثال بھی حاضر ہے۔

نسیم امروہوی نے اپنے ایک مرثیہ میں "علم" کی تعریف کی ہے۔ اس کے چند بند بلاحظہ ہوں۔

شمع حریم معرفت کبریا ہے علم
روحانیت کا ولولۂ ارتقاء ہے علم
دنیا و دیں میں رازِ حیات و بقا ہے علم
ذرّہ ہے خلق، عالمِ بے انتہا ہے علم
یہ کیوں کہوں خدا کا شریکِ صفات ہے
اللہ سے جدا ہی نہیں، عینِ ذات ہے

اللہ رے علم، منزلتِ علم، شانِ علم
تخلیقِ بو البشر کا سبب، امتحانِ علم
اسلام کیا ہے؟ بہرِ عمل، ترجمانِ علم
قرآں بیانِ علم، حدیثیں زبانِ علم
انسان جو کہ جہل و خودی کا غلام ہے
راسخ ہو علم میں تو نبی یا امام ہے

یہ علم دو جہاں میں وہ نعمت ہے لاجواب
اپنے لیے خدا نے کیا جس کو انتخاب
آدم ہوئے جو اس کی فضیلت سے فیضیاب
بخشا خدا نے اشرفِ مخلوق کا خطاب
جس نے رکھا عزیز وہ انسان ہو گیا
تحقیر جس نے کی وہی شیطان ہو گیا

ہے سرمدی علوم کا چشمہ یہ کائنات
ہر ذرۂ جماد، ہر اک ریشۂ نبات
اک درس گاہ ہے جسے کہتے ہیں ہم حیات
تعلیم دے رہے ہیں مسلسل تغیرات
ہر برگ یاں ہے دفترِ عرفاں لیے ہوئے
ہر خار، معرفت کا گلستاں لیے ہوئے

یہ ختمِ شب، یہ گرمیِ ہنگامۂ سحر
یہ صبح اور یہ دن کی تجلی، یہ دوپہر
یہ شام اور شام کے لمحاتِ مختصر
یہ رات اور رات میں یہ انجم و قمر
اک درس دے رہے ہیں جہاں کو علوم کا
ہیئت کا مدرسہ ہیں تو مکتب نجوم کا

یہ موسمِ بہار، یہ رعنائیِ چمن
پھولوں کا یہ نکھار، شگوفے یہ گلبدن
پودوں کا یہ شباب یہ شاخوں کا بانکپن
سرو و صنوبر و گل و ریحان و یاسمن
سب مظہرے ہیں انجمنِ کائنات کے!
دن رات گل کھلاتے ہیں علمِ نبات کے!

عالمِ خیال، یہ دنیائے بحر و بر
جغرافیے کے موجد و بانی ہیں سر بہ سر
ابر و باد، ژالہ و شبنم یہ خشک و تر
طبعی علوم کے ہیں خزانے یہ بالبشر
پنہاں جو خط و خال ہیں نقشِ شہود میں
آیا ہے اس سے علم رسالت وجود میں

ہوتے رہے جو روز و شب جو زمانے میں واقعات — مل جل کے لکھ رہے ہیں یہ تاریخ کائنات
علمِ حیات کو ہے بنا خود ہی حیات — ہر چیز، ہر وجود، ہر اک شے ہے ترکیبات
ہر فلسفے کی عقلِ بشر رازدار ہے
منطق ہمارے نطق کا اک شاہکار ہے

برقِ تپاں سے حکمتِ برقی ہے ضوفشاں — فطرت کے قاعدے ہیں ریاضی کے رازداں
طب کا وجود جسمِ بشر میں ہے خود نہاں — فنِ سرود، نغمۂ بلبل سے ہے عیاں
تمہید ساز ربطِ بادِ بہار ہے
استادِ رقص گردشِ لیل و نہار ہے

ڈالے جو خلقتِ بشری پر کوئی نگاہ — پائے گا اس عالمِ اکبر کی جلوہ گاہ
مخفی مجاز میں ہے حقیقت، خدا گواہ — حق تو یہ ہے کہ وہم "انا الحق" نہیں گناہ
خود نفس کا بغور بشر امتحان لے
پہچان لے خدا کو جو اپنے کو جان لے

دریا ہے خود معلمِ علمِ شناوری — ہر اک صدف ہے بحر کے دامن میں جوہری
غافل! اگر نہ جادۂ ہستی سے سرسری — ہر نقشِ پا سے ہوتا ہے بینا کی رہبری
علم و ہنر کی عرصۂ ہستی میں دھوم ہے
ہر ذرہ اک کتابِ فنون و علوم ہے

وہ آنکھ جو ہے ذوقِ بصیرت سے بے نیاز — وہ کان جو کہ سن نہ سکے نغمہ ہائے راز
وہ عقل جس کو فکر و نظر سے ہو احتراز — وہ دل کہ جس میں سوزِ طلب سے نہیں گداز
جس کا یہ رنگ ڈھنگ، یہ شیوہ، یہ طور ہے
واللہ آدمی وہ نہیں ہے کچھ اور ہے!

~~~
~~~

مسدس نما مرثیے

آیئے پرانے طرز کے مرثیوں سے کافی مثالیں دیکھ لیں۔ اب آیئے اس نئے طرز کے مرثیوں کی بھی سیر کیجیے۔ جسے قدیم ڈھنگ کے مرثیہ گو مسدس ہی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ جدید مرثیہ گویوں کے سرخیل جوش ملیح آبادی، آل رضا، نسیم امروہوی، نجم آفندی اور جمیل مظہری ہیں۔ وفا ملک پوری، زائر سیتاپوری، آفر لکھنوی، نسیم کرہانی وغیرہ بھی اسی گلشن بہار کے مالی ہیں۔ ان میں سے بعض کے کلام سے ماقبل کے صفحات میں مثالیں پیش ہو چکی ہیں۔ کچھ نامدار ابھی باقی ہیں ان کے بعض مسدسوں سے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

نجم آفندی

نجم آفندی کا تازہ ترین مرثیہ "معراج فکر" شاعرانہ کمالات کا نمونہ ہے اس کے ہر بند میں فکر و عمل کی تبلیغ بڑے پُراثر انداز میں کی گئی ہے۔ اس کے چند بند جگہ جگہ سے ملاحظہ ہوں۔

صورت گر جلالت اسلام ہے حسینؑ — اک مرکزِ روابطِ اقوام ہے حسین
فکر و نظر مشیت و الہام حسین — محبوبِ اہلِ درد، بس اک نام حسین
دریا مخالفت کے چڑھے اور اتر گئے
باقی رہا یہ نام، حوادث گزر گئے

انسانیت کو جس نے سنوارا ہے وہ حسین — جو حسن معنوی کا سہارا ہے وہ حسین
جس نے دلوں میں درد ابھارا ہے وہ حسین — رُوحِ بشر کو جس نے پکارا ہے وہ حسین
آواز جس کی دور کے انسان تک گئی
بجلی سی سامعہ کی فضا میں چمک گئی

خوددار زندگی کا جو حامی ہے وہ حسین — عزت کی موت کا جو پیامی ہے وہ حسین
جو خالقِ شعورِ عوامی ہے وہ حسین — ہر قوم کی نظر میں گرامی ہے وہ حسین
واقف نہیں بشر جو بہتّر کے نام سے
مانوس ہیں حسین علیہ السلام سے

جو حق کی معرفت کا ہی مفہوم وہ حسین — جس کا خیال و خواب ہے معصوم وہ حسین
جس کے ثبات عزم کی ہے دھوم وہ حسین — جس کا ہے نام قوتِ مظلوم وہ حسین
مظلومیت کو عزم دیا حوصلہ دیا
اظہار حق کا جس نے سلیقہ سکھا دیا

ہر قوم میں ہے جس کی شہادت کا احترام — دنیا میں جس کا نام ہے اِک مستقل پیام
اس درجہ اس کا ذکر ہے مقبول خاص و عام — ہر اک زباں کے شعر و ادب میں ملا مقام
تقریر و نظم و نثر کی کچھ انتہا نہیں
اب تک کسی کا تذکرہ اتنا ہوا نہیں

توریت میں بھی جس کی شہادت کا ہے بیاں — ہوتا ہے کچھ زبور سے بھی ماجرا عیاں
انجیل بھی ہے جس کے منازل کی ترجماں — یہ جملہ انبیاء کے صحائف ہیں ہم زباں
تنظیم کائنات کا قلب صمیم ہے
قرآں میں وہ معنیٔ ذبح عظیم ہے

بے امتیاز مذہب و ملت ہے جس کا سوگ — اکثر مٹا دیا ہے تعصب کا جس نے روگ
کتنے ہیں اب قریب بہت دور تھے جو لوگ — نامسلموں نے عشق میں جس کے لیا ہے جوگ
بھارت نواسیوں کو خطاب اک نیا دیا
کتنے برہمنوں کو حسینی بنا دیا

حاصل یہ جس کے غم کو ہوئی عظمتِ گراں — قید زماں ہے اور نہ پابندی مکاں
اب تک جو ہے محبتِ بر حق کا ترجماں — خود واجب الوجود ہے جس کا نگاہباں
ہر غم کا زور جاری اشکوں میں بہہ گیا
یہ غم جہاں میں حق کی اشاعت کو رہ گیا

انسانیت شرافت غم سے تھی بے خبر — مظلومیٔ حسین کا اللہ رے اثر!
ہر سانس خوشگوار ہے، ہر آہ معتبر — ہر عیش سے ہے آج یہ جذبہ بلند تر
غم تھے ہزار، غم کو یہ عظمت ملی نہ تھی
آنسو تھے، آنسوؤں میں حرارت کبھی نہ تھی

انصار تھے حسین کے کیا کیا وفا پسند
تیور بنی پسند، ادائیں خدا پسند
پہلو میں تھا ہر ایک کے دل کربلا پسند
یہ دین کا فروغ تھا، دنیا کو نا پسند
گُل ہے چراغ جور، یہ قدرت خدا کی ہے
روشن جہاں میں شمع مگر کربلا کی ہے

اہلِ زمین کی آج ستاروں پہ ہے نظر
ممکن ہے کامیاب رہے چاند کا سفر
ہیں اپنی اپنی فکر میں ہر قوم کے بشر
مردانِ حق پرست کا جانا ہوا اگر
عباس نامور کا علم لے کے جائیں گے
ہم چاند میں حسین کا غم لے کے جائیں گے

ب:۔ انھیں نجم آفندی کے ایک دوسرے "مسدس" مرثیہ کے چند بند ملاحظہ ہوں۔ دیکھیے پہلے ہی مصرعہ سے آجکل کا بدلا ہوا انداز نظر صاف ظاہر ہے۔ اس پر کمال یہ ہے کہ پورے واقعہ کربلا کا بیان، تاراجی خیام اور اسیری آلِ اطہار کی منظر کشی کے ساتھ ساتھ اس پر برابر مفکرانہ نظر ڈالتے جا رہے ہیں۔ مرثیہ کی خصوصیت یعنی رثائیت بھی کہیں ہاتھ سے جانے نہیں پاتی۔

جب لے لیا حسین نے میدان کربلا
بدلا لہو سے رنگ بیابان کربلا
تھا وقت عصر اور یہی عنوان کربلا
سوتا تھا فرش خاک پہ مہمان کربلا
بے سر تھا قتل گاہ میں لاشہ پڑا ہوا
بالیں پہ فتح حق کا تھا جھنڈا گڑا ہوا

ریتی کی سجدہ گاہ پہ خونِ پیمبری
ڈوبی ہوئی لہو میں قبائے غضنفری
کون و مکاں میں رعبِ شہادت سے تھرتھری
ایسی سکندری تھی کہ کسی کی نہ قیصری
اس دن سے آج تک یہ حکومت کا زور ہے
ہر سمت "یا حسین" کا دنیا میں شور ہے

وہ جنت کو فخر، وہ انسانیت کا ناز
وہ روبہ قبلہ دینِ پیمبر کا چارہ ساز
مقتل کی سرزمین کو وہ مولد سے امتیاز
چھائی ہوئی حسین کی وہ آخری نماز

معراج آدمی کے قرار و شکیب کی
ہمدوش کہکشاں وہ بلندی نشیب کی

وہ شاندار موت وہ بنیاد انقلاب — بیعت کا وہ سوال، وہ دنداں شکن جواب
مجبوری حیات سے کونین کو حجاب — نیزہ پہ سر حسین کا مغرب میں آفتاب
صدقے ضیائے مہر و قمر آن بان پر
تارے درود پڑھتے ہوئے آسمان پر

اس کے پیام اس کی امانت کو آفریں — سوکھے لبوں پہ حرف حقیقت کو آفریں
اس دل کو، دل میں مہر کی قدرت کو آفریں — جسم بشر میں روح شرافت کو آفریں
اس پر سلام پیاس کے صدمے جو سہہ گیا
کہنے کی بات حلق بریدہ سے کہہ گیا

عالم میں بے مثال ہے یہ کربلا کی جنگ — یکساں وفائی بندہ و آقا کو تھی امنگ
کچھ سن کا امتیاز، نہ تفریق نسل و رنگ — حق کی صدائے عام تھی، میدان تھا نہ تنگ
ہر باوفا حسین کے قدموں میں سو گیا
آقا کا خون غلام کا خوں ایک ہو گیا

وہ اردگرد پیکر انصار باوفا — دریا، ملک، عزیز تھے قدموں کا سلسلہ
ہر عہد میں ہیں ذکر کے قابل وہ باوفا — چھوٹے بڑے سب ایک ہی منزل کے رہنما
بعد فنا بھی جوشش و غا میں تنے ہوئے
بچے ذرا ذرا سے سپاہی بنے ہوئے

لرزاں مثال بید وہ دنیائے آب و گل — وہ کارواں لٹا ہوا لاشوں کے متصل
خیموں کی طرح سینوں میں جلتے ہوئے وہ دل — بچے بھی فرش خاک پہ خاموش مضمحل
نازاں تھے جو حسین پہ وہ دل ہی نہیں رہے
فریاد العطش کے بھی قابل نہیں رہے

چھائی ہوئی فضا میں المناک خامشی — شامل ہوائے دشت میں وہ خون کی تری
بجھتی ہوئی خیام کے شعلوں کی روشنی — وہ غم میں وارثوں کے اسیران زندگی

بیٹھے ہوئے زمین پہ کلیجوں کو تھام کے
کھوئے ہوئے غریب دھندلکے میں شام کے

تپتی ہوئی زمین پہ وہ لاشے ادھر اُدھر — بھائی کسی کا تھا تو کسی کا جواں پسر
وارث پڑا ہوا تھا کسی کا لہو میں تر — ٹکڑے دل و جگر کے اور اک دُور کی نظر!
جاتے ہوئے وداع نہ کرنے کو دیکھئے
مقتل سے قیدیوں کے گزرنے کو دیکھئے

کس درجہ دردناک تھا رخصت کا یہ سماں — کہتا کسی سے کون کہ خالق نگاہباں
اتنا بھی کوئی پوچھنے والا نہ تھا یہاں — زندوں پہ کیا گزر گئی کشتوں کے درمیاں
یوں تو حرم کی عمر ہی اس غم میں کٹ گئی
کس طرح قتل گاہ میں لیکن یہ شب کٹی

ہنگام عصر ختم ہوئی جنگ کربلا — اک دوسرے جہاد کا آغاز ہو گیا
تکمیل کار کے لئے بیمار غم اٹھا — اب اس کے دوش پہ تھا نشاں انقلاب کا
قید ستم میں سینہ سپر خدا کا ہنر بر تھا
تا شام ایک معرکۂ ضبط و صبر تھا

قائم رضا نسیم — ۱۳۷۱ھ میں بیز وہ یادگار "شہادت حسین" کے موقع پر قائم رضا نسیم نے ایک مرثیہ بشکل مسدس، کہا۔ اسے انیس و حالی کے رنگ کا سنگم کہا جا سکتا ہے۔ اس میں بھی ایک ساقی نامہ ہے جو قصیدہ کی طرح مدح سے بھرے ہونے کے ساتھ ساتھ مرثیت سے پُر ہے۔ اس کے چند بند حاضر ہیں۔ وہ امت کے حال زار کی طرف رسول مقبول کو متوجہ کرکے ان سے فریاد کرتے ہیں کہ امام عصر کو جلد بھیجیں کہ وہ امت کے لئے ساقی کا فریضہ ادا فرمائیں۔ مگر یہ شراب جو وہ حضرت پلائیں گے وہ کس طرح کی ہوگی وہ نسیم ہی کی زبان سے سنئے:۔

وہ آج چشمۂ آب بقا ہو پھر جاری — مسیح و خضر کہیں جس کو روح بیداری
ہر ایک موج میں یہ جائیں کیفیتیں ساری — ہر ایک بوند ہے غفلت کے حق میں چنگاری

وہ مے جو دین کی رگ رگ میں ہے سمائی ہوئی
نبی سے صاحبِ تقویٰ کی پی پلائی ہوئی

نہاں رہی جو کبھی "قل کفیٰ" کے پردے میں | جھلک دکھائی کبھی انّما کے پردے میں
کبھی رسولؐ نے پی لی عبا کے پردے میں | کبھی خدا نے پلا دی ہل اتیٰ کے پردے میں

نیا وہ دور بھی تھا رنگ بھی نرالا تھا
مزہ تو یہ ہے کہ ساقی بھی ہم پیالہ تھا

وہ مے پلائے جو عمارِ ذی وقار نے پی | وہ مے جو بوذر و سلمان جاں نثار نے پی
اویس و زید نے، مقدارِ نامدار نے پی | اذاں کے وقت بلالِ وفا شعار نے پی

عجیب صاحبِ قسمت وہ پینے والے تھے
نبی کا دور تھا، آیات کے پیالے تھے

وہ مے پلا جو حبیبِ ملک خصال نے پی | بریر و وہب نے پی، بدرِ خوش جمال نے پی
حُرِ دلیر نے پی، عابس و ہلال نے پی | زہیرِ قین نے پی، عوسجہ کے لال نے پی

اسی کے جوش میں کھا کھا کے زخم جھومتے تھے
زمیں پہ گر کے بھی ساقی کے پاؤں چومتے تھے

اسی شراب کے طالب ہیں آج بھی میخوار | کہ جس پہ عون و محمد ہوئے خوشی سے نثار
رہے گا یاد یہ بچوں کا جوشِ بے اختیار | قریب نہر کے پیاسے گزر گئے جرّار

صغیر سن میں یہ ہمت نہ یہ وفا ہوگی
نہ رخ کیا سوئے دریا کہ ماں خفا ہوگی

پلا وہ جام کہ اکبر کا جس سے تھا یہ حال | گڑا جو سینے میں نیزہ ہوئے نہ غم سے نڈھال
پر اپنے وعدہ کا اتنا تھا باوفا کو خیال | کہا یہ غش سے دمِ نزع بھی بہ حزن و ملال

الم نہیں جو یہ برچھی ہزار بار چلے
مگر یہ غم ہے کہ صغرا سے شرمسار چلے

بیاں ہو کیا ترے صہبا کی ساقیا تاثیر | جوانِ دہر کا کیا ذکر محو تھا بے شیر
کہاں وہ تشنگیِ مے گردنِ کماں بہ پہلو تیر | صغیر چپ رہا، رونے لگے مگر بے پیر

دکھا دیا کہ بہادر کڑی کو جھیلتے ہیں
علی کے لاڈلے یوں ناوکوں سے کھیلتے ہیں

عجیب مے ہے یہ پروردۂ ذبیح و خلیل — اثر سے جس کے تھے محو وصال شاہ جلیل
پکارتے تھے کہ "تیغو بزعمو بعد تعجیل — پیو یہ خون لبشریت کے نام کی ہے سبیل
لہو بہا کے سوا میری آبرو کر دو
علی کے لال کو نانا سے سرخرو کر دو!"

~~~

جوش ملیح آبادی

اب شاعر انقلاب، جوش ملیح آبادی کے "مسدس" کے کچھ بند ملاحظہ ہوں:-

اس خونچکاں حیات کے آلام کیا کہوں — قدرت نہیں فسانۂ ایام کیا کہوں
دارائے کائنات کے انعام کیا کہوں — یہ داستان مرحمت عام کیا کہوں
کہہ دوں تو دل سے خون کا چشمہ نکل پڑے
اور چپ رہوں تو منھ سے کلیجہ نکل پڑے

یوں تو غم معاش کا سوز نہاں ہے اور — تکلیف جاں گدازیِ عشق بتاں ہے اور
لب تشنگی و شیب و عذاب خزاں ہے اور — اعلان حق کی درد مگر داستاں ہے اور
گفتار صدق مایۂ آزار می شود
چوں حرف حق بلند شود دار می شود

ہاں، اس بلا سے کوئی بلا بھی بڑی نہیں — کیا اس کو علم جس پہ یہ بپتا پڑی نہیں
کشتوں کی اس کے لاش بھی اکثر گڑی نہیں — اعلان امر حق سے کوئی تیغ کڑی نہیں
بے جرم خود کو حشر میں جو راندھے وہ آئے
اس راہ میں جو سر سے کفن باندھے وہ آئے

اور بالخصوص جب ہو حکومت کا سامنا — رعب شکوہ و جاہ و جلالت کا سامنا
شاہان کج کلاہ کی ہیبت کا سامنا — قرنا و طبل و ناوک و رایت کا سامنا
~~~

لاکھوں میں ہے وہ ایک کروڑوں میں فرد ہے
اس وقت جو ثبات دکھائے وہ مرد ہے

اور بالخصوص بند ہو جب ہر در نجات — حق تشنہ لب ہو دشت میں باطل لب فرات
دستِ اجل میں ہو زن و فرزند تک کی ذات — حائل ہو مرگ و زیست میں دیکھے ایک ذات
یہ وہ گھڑی ہے کانپ اٹھے خیبرز کا دل
اس تہلکے کو چاہیئے فوق البشر کا دل

وہ کربلا کی رات وہ ظلمت ڈراؤنی — وہ مرگِ بے پناہ کے سائے میں زندگی
خیموں کے گرد و پیش وہ پُر ہول خامشی — خاموشیوں میں دور سے وہ چاپ موت کی
تھی پشت وقت بارِ الم سے جھکی ہوئی
ارض و سماں کی سانس تھمی گویا رکی ہوئی

وہ رات وہ فرات وہ موجوں کا خلفشار — عابد کی کروٹوں پہ وہ بیچارگی کا بار
وہ زلزلوں کی زد پہ خواتین کا وقار — اصغرؑ کا پیچ و تاب وہ جھولے میں بار بار
اصغر میں پیچ و تاب نہ تھا اضطراب کا
وہ دل دھڑک رہا تھا رسالت مآب کا

ہاں ہاں وہ رات، دہشت و بیم و رجا کی رات — افسونِ جاں کنی و طلسم قضا کی رات
لب تشنگان ذریت مصطفےٰؐ کی رات — جو حشر سے عظیم تھی وہ کربلا کی رات
شبیر نے حیات کا عنواں بنا دیا
اس رات کو بھی صبح درخشاں بنا دیا

تاریخ دے رہی ہے یہ آواز دمبدم — درختِ ثبات و عزم ہے دشتِ بلا و غم
صبرِ مسیح و جرأتِ سقراط کی قسم — اس راہ میں ہے صرف اک انسان کا قدم
جس کی رگوں میں آتشِ بدر و حنین ہے
جس سورما کا اسمِ گرامی حسینؑ ہے!

جو اک نشانِ تشنہ دہانی تھا وہ حسینؑ — گیتی پہ عرش کی جو نشانی تھا وہ حسینؑ
جو خلد کا امیر جواناں تھا وہ حسینؑ — جو اک سنِ جدید کا بانی تھا وہ حسینؑ

جس کا لہو تلاطمِ پنہاں لئے ہوئے
ہر بوند میں تھا نوح کا طوفاں لئے ہوئے

جو کاروانِ عزم کا رہبر تھا وہ حسینؑ   خود اپنے خون کا جو شناور تھا وہ حسینؑ
اک دینِ تازہ کا جو پیمبر تھا وہ حسینؑ   جو کربلا کا داورِ محشر تھا وہ حسینؑ

جس کی نظر پہ شیوۂ حق کا مدار تھا
جو روحِ انقلاب کا پروردگار تھا

ہاں اب بھی جو منارۂ عظمت ہے وہ حسینؑ   اب بھی جو محوِ درسِ محبت ہے وہ حسینؑ
جس کی نگاہ مرگِ عداوت ہے وہ حسینؑ   آدم کی جو دلیلِ شرافت ہے وہ حسینؑ

واحد جو اک نمونہ ہے ذبحِ عظیم کا
اللہ رے انتخاب خدائے حکیم کا

ہاں وہ حسین جس کا ابد آشنا ثبات   کہتا ہے گاہ گاہ حکیموں سے بھی یہ بات
یعنی درونِ پردۂ صد رنگِ کائنات   اک کارساز ذہن ہے، اک ذی نفس حیات

سجدوں سے کھینچتا ہے جو مسجود کی طرف
تنہا جو اک اشارہ ہے معبود کی طرف

عزت پہ جس نے سر کو فدا کر کے دم لیا   صدق و منافقت کو جدا کر کے دم لیا
حق کو ابد کا تاج عطا کر کے دم لیا   جس نے یزیدیت کو فنا کر کے دم لیا

فتنوں کو جس پہ ناز تھا وہ دل بجھا دیا
جس نے چراغِ دولتِ باطل بجھا دیا

عالم میں ہو چکا ہے مسلسل یہ تجربا   قوت ہی زندگی کی رہی ہے گرہ کشا
سر ضعف کا ہمیشہ رہا ہے جھکا ہوا   ناطاقتی کی موت ہے، طاقت کا سامنا

طاقت سی شے مگر خجل و بدنصیب تھی
ناطاقتی حسینؑ کی کتنی عجیب ، تھی!

طاقت سی شے کو خاک میں جس نے ملا دیا   تختہ الٹ کے قصرِ حکومت کو ڈھا دیا
جس نے ہوا پہ رعبِ امارت اڑا دیا   ٹھوکر سے جس نے افسرِ شاہی گرا دیا

اِس طرح جس سے ظلم سیہ فام ہو گیا
لفظِ یزید داخلِ دشنام ہو گیا

پانی سے تین روز ہوئے جس کے لب نہ تر — تیغ و تبر کو سونپ دیا جس نے گھر کا گھر
جو مر گیا ضمیر کی عزت کے نام پر — ذلت کے آستاں پہ جھکایا مگر نہ سر
لی جس نے سانس رشتۂ شاہی کو توڑ کر
جس نے کلائی موت کی رکھ دی مروڑ کر

جس کی جبیں پہ کج ہے خود اپنے لہو کا تاج — جو مرگ و زندگی کا ہے اک طرفہ امتزاج
سر دے دیا، مگر نہ دیا ظلم کو خراج — جس کے لہو نے رکھ لی تمام انبیاء کی لاج
سنتا نہ کوئی دہر میں صدق و صفا کی بات
جس مردِ سر فروش نے رکھ لی خدا کی بات

یہ صبحِ انقلاب کی جو آج کل ہے ضو — یہ جو مچل رہی ہے صبا، پھٹ رہی ہے پو
یہ جو چراغِ ظلم کی تھرا رہی ہے لو — در پردہ یہ حسینؑ کے انفاس کی ہے رو
حق کے چھڑے ہوئے ہیں جو یہ ساز دوستو
یہ بھی اسی جری کی ہے آواز دوستو

پھر حق ہے آفتاب لبِ بام اے حسینؑ — پھر بزمِ آب و گل میں ہے کہرام اے حسینؑ
پھر زندگی ہے سست و سبک گام اے حسینؑ — پھر حریت ہے موردِ الزام اے حسینؑ
ذوقِ فساد و ولولۂ شر لیے ہوئے
پھر عصرِ نو کے شمر ہیں خنجر لیے ہوئے

مجروح پھر ہے عدل و مساوات کا شعار — اس بیسویں صدی میں ہے پھر طرفہ انتشار
پھر نائبِ یزید ہیں دنیا کے شہریار — پھر کربلائے نو سے ہے نوعِ بشر دوچار
اے زندگی! جلالِ شہِ مشرقین دے
اس تازہ کربلا کو بھی عزمِ حسینؑ دے

ل یہ مسدس انگریزی حکومت کے عہد میں کہا گیا تھا۔

شمیم کرہانی

شمیم کرہانی کی ۶۹ بندوں کی نظم " ذوالفقار " اردو کے جدید مرثیوں میں خاص طرح کی چیز ہے۔ بقول پروفیسر احتشام حسین انھوں نے واقعہ کربلا پر غور کرتے ہوئے اس تسلسل کی جستجو کی ہے جو رسول اسلام، حضرت علیؑ - اور امام حسنؑ کے اقوال، افکار اور خیالات میں کردار، عمل اور مقاصد میں پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اسلام کے اس انقلاب پر نگاہ کی جو بڑے، چھوٹے، کالے گورے امیر غریب، عرب عجم کے فرق کو مٹانے کے لیے آیا تھا جس کا مقصد انسانی اخلاق کی تکمیل تھا، جس کا نصب العین انسانوں کو انسان بنانا، جہل سے علم کی روشنی میں لانا اور شرافتِ نفس کو ظاہر کرنا تھا - اس طرح انھیں یہ محسوس ہوا کہ رسول مقبول، حضرت علیؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ نے ان مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے جو ذرائع اختیار کئے وہ اعلیٰ انسانی قدروں کے مظہر تھے - چنانچہ وہ چیز جو بظاہر جنگ اور خونریزی معلوم ہوتی تھی، سماج سے اس فاسد مادے کے نکالنے کا حربہ بن گئی جس کی وجہ سے اس عہد کی دنیا بیمار اور علیل معلوم ہوتی تھی۔ ذوالفقار کا عمل صاحب ذوالفقار کا عمل ہے اور اسی کے کارنامے اس کے چلانے والے کے مقاصد کے کارنامے ہیں۔ پوری نظم قصیدہ کی شان رکھتی ہے لیکن آخری بندوں میں وہ بڑی خوبصورتی سے مرثیہ بن گئی ہے - چند بند پیش ہیں :-

باطل شکن، مجاہد ایماں تھی ذوالفقار ۔۔۔ تدبیر چارہ سازیِ انساں تھی ذوالفقار
شیرِ خدا کی جنبشِ مژگاں، تھی ذوالفقار ۔۔۔ آئینہ جلالتِ یزداں تھی ذوالفقار

روشن ہے کائنات یہ، قیمت میں قدر میں
اتری تھی آسمان سے، چمکی تھی بدر میں

کافر کی رہ گزار میں، آندھی، شررِ بلا ۔۔۔ مومن کی انجمن میں دھنک، نکہتِ صبا
ہر جنگ میں بلند، توانا، قوی، رسا ۔۔۔ تلوار تھی کہ احمد مختار کی دعا

ٹیکا ہو جو ضرب پڑی کارگر ہوئی
پھوٹی کرن، دیارِ عرب میں سحر ہوئی

ظلمت شکن، چراغِ شبِ اہلِ اعتبار — ایماں پسند، حسن تیقن کی جلوہ زار
چلتی تھی ساتھ ساتھ لئے دین کی بہار — منشائے ذوالفقار تھا منشائے کردگار
حکم خدا سے جنگ میں مصروف کار تھی
تلوار تھی کہ کلکِ مشیّت نگار تھی

سلطان و زیر ہوں کہ رفیقانِ فاقہ مست — تھے عدل کی نگاہ میں یکساں بلند و پست
کرتی تھی انقلابِ تمدّن کا بندوبست — رجعت پسند ذہن کو دیتی تھی وہ شکست
جمہور کی رفیق، عدو سامراج کی
ناظم معاشرت کی، مدبر سماج کی

صحنِ چمن، جبینِ عرق آشنا کی ضو — عشرت شباب تیشۂ محنت کی صبحِ نو
کھیتی، چراغ خونِ جفاکش کی سبز ہو — لیکن جفا نصیب کے حصے میں نانِ جو
یہ ظلم بے سزا، یہ شقاوت معاف تھی
تلوار اسی طریقِ عمل کے خلاف تھی

آوازِ جاں گداز تھی اغیار کے لئے — پیغام دل نواز تھی دیندار کے لئے
حرفِ ظفر تھی حیدرِ کرار کے لئے — حصنِ حصین تھی احمدِ مختار کے لئے
تیغ دو دم امینِ جلال و جمال تھی
تلوار تھی علی کی، محمد کی ڈھال تھی

مسلک تھا ذوالفقار کا ایمان و اعتقاد — رکھتی تھی اپنے مالکِ صابر پہ اعتماد
دینا پڑی مورخ عالم کو جب کہ داد — تھی سیفِ مرتضیٰ کی خموشی بھی اک جہاد
اسلام پر فساد کا در کھولتی نہ تھی
بعدِ رسول مصلحتاً، بولتی نہ تھی

دانا تھی، دور بین تھی، حقیقت شعار تھی — اسرارِ رزم و بزم کی آئینہ دار تھی
عہدِ مصالحت ہو تو حسنِ قرار تھی — تلوار تھی کہ مصلحتِ کردگار، تھی
خاموش رہ کے فاتحِ اسلام ہو گئی
عہدِ حسن میں صلح کا پیغام ہو گئی

خندق میں حسنِ جلوہ نمائی دکھا گئی — خیبر میں زورِ عقدہ کشائی دکھا گئی
صفین میں کمالِ صفائی دکھا گئی — تیغِ خدا تھی شانِ خدائی دکھا گئی
ہر معرکے میں ناخنِ تدبیر ہو گئی
اور کربلا میں صبر کی تصویر ہو گئی

ہر چند اس نے حکم نہ پایا جہاد کا — لیکن وہ بند کر کے رہی درِ فساد کا
ٹھنڈا مزاج کر دیا ہر بدنہاد کا — پھر جل سکا چراغ نہ ابنِ زیاد کا
ضو تیغ کی یزیدِ بدانجام تک گئی
وہ صبح تھی کہ جس کی چمک شام تک گئی

غصہ کہ دینِ حق پہ ہے کیوں حکمراں یزید — علم و یقینِ حسینؑ میں، وہم و گماں یزید
رکھتا نہیں لحاظِ لبِ تشنگاں یزید — انساں پہ بند کرتا ہے آبِ رواں یزید
تھا مال و زر سے کام نہ بختِ بلید سے
جینے کا حق وہ مانگ رہی تھی یزید سے

افسوس حکمِ جنگ نہیں ذوالفقار کو — ورنہ الٹ کے رکھ دے ابھی کارزار کو
پانی پلائے لا کے تشنۂ دلِ فگار ، کو — پر کیا کرے وہ مصلحتِ کردگار کو
تیغِ ظفر ہے فاتحِ بدر و حنین کی ؟
چپ چاپ تک رہی ہے جو صورت حسینؑ کی

اک روز قلعہ گیر تھی شمشیرِ حیدری — اب اک عصائے پیر تھی شمشیرِ حیدری
مظلوم تھی، اسیر تھی، شمشیرِ حیدری — اشکوں کی ایک لکیر تھی شمشیرِ حیدری
شمشیرِ غمزدہ میں جھلک ابتلا کی تھی
یا ڈبڈبائی آنکھ شہِ لافتیٰ کی تھی

اصغرؑ کی غمگسار ہے، اکبرؑ کی غمگسار — بنتِ نبی کے چاند سے دلبر کی غمگسار
سارے عزیز و ہمدم و یاور کی غمگسار — صحرائے بیکسی میں بہتر کی غمگسار
تلوار ہو گئی حیدرِ کرارؑ کے لئے
تکیہ ہے آج عابدِ بیمارؑ کے لئے

وہ دوپہر وہ چہرۂ شبیرؑ پر غبار ۔۔۔ وہ حرملہ کا تیر، وہ حلقوم شیر خوار
جلتی ہوئی وہ ریت، وہ بانو کا گلعذار ۔۔۔ تھرا رہی تھی فاتح خیبر کی ذوالفقار
یہ بھی تھا کام تیغ دو پیکر کے واسطے
تیار کی لحد، علی اصغر کے واسطے

کٹتا ہوا حسین کا سر دیکھتی رہی ۔۔۔ جلتا ہوا رسول کا گھر دیکھتی رہی
بنتِ علی کو برہنہ سر دیکھتی رہی ۔۔۔ دیکھا نہ جا رہا تھا، مگر دیکھتی رہی
ایسا پڑا نہ وقت کبھی ذوالفقار پر
کیا اعتراض ہے مرضیِ پروردگار پر!

~~~~~

زائر سیتاپوری

زائر سیتاپوری اپنے مسدس کی ابتدا دنیا میں ظلم و جور کی حکومت کے بیان سے شروع کرتے ہیں۔ اس کے چند بند ملاحظہ ہوں :-

دولت سے ہے تمیز شریف و رذیل کی ۔۔۔ پھر اس میں بھی حدیں ہیں کثیر و قلیل کی
انسانیت کی قدر نہ نفسِ جلیل کی ۔۔۔ بس مرکزِ خیال ہے جھوٹی تخیل کی
جنت ہے اک نگاہِ تمنا کے سامنے
سجدے میں دل ہیں دولتِ دنیا کے سامنے

دنیا میں ہر نظام کا پابند ہے غریب ۔۔۔ بہکا ذرا جو پاؤں تو گردن میں ہے صلیب
محنت سے ہے دو چار کچھ اسطرح غم نصیب ۔۔۔ آتا نہیں سکون کبھی خواب میں قریب
سب سے بڑا ہے جرم یہ اس کا، فقیر ہے
قانون کے شکنجے کے اندر اسیر ہے

صحرا کی اک صدا ہے کہ مزدور کی فغاں ۔۔۔ پانی کا بلبلا ہیں فقط ان کی ہچکیاں
لوٹا گیا عجیب طرح ان کا کارواں ۔۔۔ رہزن ہوئے تھے ساتھ میں خود ان کے پاسباں
روداد غم سنائیں کہاں التجا کریں
دعوائے خون، عدالتِ قاتل میں کیا کریں
~~~~~

اُف! درد سے بھری وہ کسانوں کی زندگی
روتی ہے جس کے حال پہ خود ان کی بیکسی
وہ کشمکش حیات کی، وہ ان کی خامشی
افلاس کی وہ ان پہ نگاہیں جمی ہوئی
چُپ ہیں اگرچہ دل میں غمِ کائنات ہے
اِک سازِ بے صدا ہے کہ ان کی حیات ہے

آزادیوں کی دھوم مچی ہے جہان میں
کوئی غریب کو نہیں لاتا ہے دھیان میں
اہلِ غرض ہیں چند کہ جو ہیں امان میں
کیا جلد کھل گئے جو بڑے امتحان میں
ظاہر میں گو بلند ہیں عالی مقام ہیں
ہیں جانور کہ نفس کے اپنے غلام ہیں

نظم و نسق میں قائدِ اعظم بنا کوئی
آزادیوں کی روحِ مجسم بنا کوئی
دنیا کو ترک کرکے، مکرّم بنا کوئی
اسرارِ کائنات کا محرم بنا کوئی
اب بھی مگر سکون کا دل پاش پاش ہے
دنیا کو ایک راہنما کی تلاش ہے

اس رہنما میں قوتِ ایثار چاہیے
سرمایہ سوزِ ہمتِ نادار چاہیے
پُر امن روحِ فطرتِ پیکار چاہیے
ہو صبر جس کا نام وہ تلوار چاہیے
دکھ درد سے بھرے ہوئے ہر دل کا چین ہے
ہاں، وہ فقط حسینؑ ہے، تنہا حسینؑ ہے

مزدور، فاقہ کش، وطن آوارہ، دردمند
نادار، بے نوا، الم انگیز، غم پسند
تکمیلِ نفس جس کی حوادث میں مستمند
جس کی لحد کی خاک سے آواز یہ بلند
مانوس ہے، جہاں کے ہر گرم و سرد سے
وہ زندگی نہیں ہے جو خالی ہو درد سے

وفا ملک پوری

جناب وفاؔ نے ایک مرثیہ "حسینی فتح" کی صورت میں لکھا ہے یہ نظم پانچ بندوں پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں تیرہ شعر ہیں۔ دوسرے میں صرف پانچ ہی، تیسرے میں سات، چوتھے میں چودہ اور پانچویں میں پانچ یعنی اس مرثیہ میں ہیئت کی پابندی کی گئی ہے۔ ابتدا یوں ہوتی ہے۔

دنیا میں تھا جب دورِ یزیدِ ستم آرا ۔۔۔ تھا تختِ خلافت پہ ستم گر کا اجارا
ہر سمت نکلتا تھا شریعت کا جنازا ۔۔۔ ہر شام کو اٹھتا تھا صداقت کا جنازا

جب ہچکیاں لیتے ہوئے اسلام کو دیکھا
دم توڑتے جب نانا کے پیغام کو دیکھا

دوسرے بند کے پہلے مصرعہ نے یوں لڑی جوڑی ع۔ بہتیر اٹھے کرتے ہوئے حق پہ بھروسا
تیسرے بند میں امام حسینؑ کے عزمِ جہاد کی طرف اشارہ کر کے چوتھے بند میں کمالِ ایجاز کے ساتھ سارے اعزا و اقربا کی شہادت کے بعد امام کی قربانی بیان کی ہے اور پانچواں بند یوں ختم کیا ہے۔

منسوخ کئے دم میں سب احکام یزیدی ۔۔۔ اور فتح و ظفر آپ نے جان دیکے خریدی
اب فتح حسینی کا چمکتا ہے ستارا ۔۔۔ یہ ہار کے جیتے، وہ لعین جیت کے ہارا

نوحے و سلام

نجم آفندی

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ ضمیرؔ و خلیقؔ کے قبل جو مرثیے کہے جاتے تھے۔ وہ صرف بینیہ ہوتے تھے۔ اب وہ سلاموں اور نوحوں کی صورت میں باقی رہ گئے ہیں۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ آپ شہنشاہِ نوحہ گویانِ عصر، نجم آفندی کے دو نوحے بھی اس سلسلے میں ملاحظہ فرمالیں۔

الف:۔ ننھا سپاہی (بطرز مثلث)

غربت کا بیکسی کا بادل سا چھا رہا ہے ۔۔۔ سب کٹ گئے مجاہد، خیموں میں کیا رہا ہے
ننھا سا اک سپاہی گودی میں آ رہا ہے

خودداریوں سے لب پہ آہیں ٹھہر گئیں ہیں ۔۔۔ رُک رُک گئی ہیں سانسیں، نبضیں ٹھہر گئی ہیں
ٹھہرا ہوا وہ جھولا، کیا دل ہلا رہا ہے

کیسی لٹی ہے بستی، کیسی گئی ہیں جانیں ۔۔۔ کیا شکر کر رہی ہیں، سوکھی ہوئی زبانیں
کیا صبر برس رہا ہے، کیا ضبط چھا رہا ہے

ایسے کہیں سپاہی دیکھے نہیں انیلے ۔۔۔ ماں کی طرف سے کوئی، رُخ کی بلائیں لے لے
پہلے پہل مجاہد میداں کو جا رہا ہے

ماتھے پہ ہے پسینہ، زلفیں بکھر رہی ہیں ۔۔۔ سورج کی گرم کرنیں، صدقے اتر رہی ہیں
اللہ گل سا چہرہ، کیا تمتما رہا ہے

نازک طبیعتوں کو بس ہے ذرا سی آہٹ ۔۔۔ بےچین پھر نہ کر دے، تیروں کی سنسناہٹ
آغوش میں پدر کی تسکین پا رہا ہے

یہ زندگی کی پہلی کروٹ ہے، راس آئے ۔۔۔ شبیر لا رہے ہیں، گھر سے گلے لگائے
اور موت کا فرشتہ آنکھیں بچھا رہا ہے

ننھا سا یہ مسافر دیکھو رہِ رضا کا ۔۔۔ تاریخ اسی کو فاتح لکھے گی کربلا کا
جھولے کو چھوڑ کر جو مقتل بسا رہا ہے

سارے جہاں سے کہہ دو، کون و مکاں سے کہہ دو ۔۔۔ یہ روحِ کارواں ہے، ہر کارواں سے کہہ دو
پیاسا ہے تین دن کا اور تیر کھا رہا ہے

یہ تشنگی، یہ ہچکی، یہ سن، یہ بےزبانی ۔۔۔ لائے گی رنگ اک دن، اسلام کی کہانی
خونِ گلو سے اپنے رنگیں بنا رہا ہے

مجلس میں ہوش کس کو اے نجمؔ جان و تن کا ۔۔۔ اُترا ہوا وہ چہرہ، ڈھلکا ہوا وہ منکا
اب تک دلوں پہ غم کی بجلی گرا رہا ہے

ب:۔ انھیں نجم کا یہ دکھ کا ساگر بھی دیکھئے۔ اس نوحہ میں ہلکے پھلکے ہندی الفاظ کی آمیزش نے اس کی ٹیس اور کسک کو بڑھا دیا ہے۔

ڈوبی ہوئی دکھ کے ساگر میں سورج کی سنہری تھالی تھی
اس چاند کی دس کو سانجھ تلک شبیر سے دنیا خالی تھی

بابا ہی کے دم کے ساتھی تھے، اکبر بھی گئے، اصغر بھی گئے
تکنے کو رہی ایک ایک کا منھ چھاتی یہ جو سونے والی تھی
اس ڈھب سے نہ لاگی آگ کہیں اس ڈھب سے نہ اجڑا باگ کہیں
سوکھی ہوئی پتی پتی تھی، ٹوٹی ہوئی ڈالی ڈالی تھی
دو کھیت پرے جل بہتا تھا، اور پھول ادھر کمھلاتے تھے
بن نیر یہ سوکھے جاتے تھے اور چار طرف ہریالی تھی
حیدر کے گھرانے والے سب ستونت بھی تھے، ساونت بھی تھے
ہیجے ہی اٹھالی بندوں نے، مالک نے جو بپتا ڈالی تھی
سیر در پہ حسن کی بدھوا نے، دو چاند کے ٹکڑے وار دیے
بچے تو جیالے تھے ہی مگر، ماتا بھی بڑی دل والی تھی
کیا لٹ کے گئے کربل سے حرم، جب آئیں سکھیاں ملنے کو
جس مانگ کو پوچھا اُجڑی تھی، جس گود کو دیکھا خالی تھی
سنسار کا چاہا اس نے بھلا، کٹوا دیا کنبے بھر کا گلا
شبیر کے من کے سانچے میں کرتار نے بھگتی ڈالی تھی؟
مالیے گئے سنت کی سیوا میں، دھن دو ہے الشہ کے بھگتوں کا
مکھڑے پہ لہو کی سُرخی سے، بڑھ بڑھ کے خوشی کی لالی تھی
یہ جی سے گزرنے والے تھے، یہ بات پہ مرنے والے تھے
کب موت سے ڈرنے والے تھے، سو بار کی دیکھی بھالی تھی
بجمی یہ حسینی چوکھٹ ہے، یاں آکے مرادیں ملتی ہیں
اس دوار سے بھکشا نے کے چلے، آئے تھے جھولی خالی تھی

مجالس عزا میں تحت لفظ خواں پہلے چند رباعیاں پڑھتے تھے۔ پھر کوئی سلام اور دونوں کے بعد اصل مرثیہ۔ اس لئے چند مثالیں سلاموں کی بھی پیش کی جاتی ہیں ان کے اشعار کے لئے ایک دوسرے سے مربوط ہونا ضروری نہیں ہوتا، کچھ اخلاقی ہوتے تھے

کچھ مدحِ چہاردہ معصومین میں، کچھ واقعاتِ کربلا سے متعلق۔ اس کی مثالوں کی ابتدا بھی خدائے مرثیہ گویان میر انیسؔ کے کلام سے دی جاتی ہے۔

سلام

میر انیس

(۱)

گزر گئے تھے کئی دن کہ گھر میں آب نہ تھا
مگر حسین سے صابر کو اضطراب نہ تھا

نمود و بود بشر کیا محیطِ عالم میں
ہوا کا جب کوئی جھونکا چلا حباب نہ تھا

علی کے پائے مبارک نے جو ضیا پائی
وہ نور حضرتِ موسیٰ کو دستیاب نہ تھا

فشار سے جو بچا میں ہوا زمیں کو عجب
صدا یہ قبر نے دی حکم بوتراب نہ تھا

نہ جانے برق کی چشمک تھی یا شرر کی لپک
ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا

حضورِ شاہ پھر آیا کہاں سے حُرِّ شہید
خطا کی راہ میں گر جادۂ صواب نہ تھا

اگر بہشت میں ہوتے نہ کوثر و تسنیم
تو رونے والوں کی آنکھوں کا کچھ جواب نہ تھا

فقط حسین کے بچوں پہ بند تھا پانی
بہت قریب تھی وہ نہر، قحطِ آب نہ تھا

حسین اور طلبِ آب، اے معاذ اللہ!
تمام کرتے تھے حجت، سوالِ آب نہ تھا

انیسؔ عمر بسر کردو خاکساری میں
کہیں نہ یہ کہ غلامِ ابوتراب نہ تھا

(۲)

کوئی انیسؔ، کوئی آشنا نہیں رکھتے
کسی کی آس بغیر از خدا نہیں رکھتے

کسی کو کیا ہو دلوں کی شکستگی کی خبر
کہ ٹوٹنے میں یہ شیشے صدا نہیں رکھتے

قناعت و گہرِ آبرو و دولتِ دیں
ہم اپنے کیسۂ خالی میں کیا نہیں رکھتے

ہمیں تو دیتا ہے رازق بغیرِ منتِ خلق
وہی سوال کریں جو خدا نہیں رکھتے

فقیر دوست جو ہو ہم کو سرفراز کرے
کچھ اور فرش بجز بوریا نہیں رکھتے

مسافرِ شبِ اوّل بہت ہے تیرہ و تار
چراغِ قبر ابھی سے جلا نہیں رکھتے

غمِ حسین کے داغوں سے دل کرو روشن
خبر لحد کے اندھیرے کی کیا نہیں رکھتے

سوائے کوثر و تسنیم و خلد و باغِ بہشت
یہ اشک ہیں وہ گہر جو بہا نہیں رکھتے

نہ روئے بیٹوں کے غم میں حسینؑ، واہ رے صبر
یہ داغ ہوش بشر کے بجا نہیں رکھتے

خدا نے آیۂ تطہیر جن کو سمجھا تھا
وہ پردہ دار سر دل پہ روا نہیں رکھتے

سکینہ کہتی تھی کیونکر نہ دم گھٹے اماں
دہان ہیں بند جو حجرے ہوا نہیں رکھتے

گلوئے اصغرِ معصوم و تیرِ واویلا
یہ ظلم وہ ہیں کہ جو انتہا نہیں رکھتے

فقط حسینؑ پہ یہ تفرقہ پڑا ورنہ
کسی کو لاش کو سر سے جدا نہیں رکھتے

جہازِ آلِ نبی کیا بچے تباہی سے
تلاطم ایسا ہے اور ناخدا نہیں رکھتے

انیسؔ زیست کے جان اپنی منہ سے نکلو
جو توشۂ سفرِ کربلا نہیں رکھتے

اسی سلسلے میں دو مزید سلام بھی ملاحظہ کر لیجیے۔ ایک تو بالکل پرانے ڈھنگ کا ہے دوسرا جدید طرز کا۔ ۱۔ قدیم طرز کا سلام جناب جوشؔ ملسیانی سے سنئے اور یہ ملحوظ خاطر رہے کہ ایک غیر مسلم موحد محبِّ آلِ محمدؐ کا کلام ہے۔

لو آ گئے عباسؑ دلاور لبِ دریا
لو تیغ عدو رہ گئی کٹ کر لبِ دریا

پانی بھی کسی کو نہ دیا اہلِ ستم نے
پیاسے تھے بہتّر کے بہتّر لبِ دریا

گرداب بھی اعدا سے یہ کہتے تھے بہ آواز
چلتا ہے یہ تعزیر کا حکم لبِ دریا

کیا تشنگی شوق شہادت تھی کہ عباسؑ
پیاسے ہی پلٹ آئے پہنچ کر لبِ دریا

دشمن کی صفیں درہم و برہم تھیں کچھ ایسی
شبیرؑ پہنچ جاتے تھے اکثر لبِ دریا

اس غم سے کہ بچوں کو بھی ملتا نہیں پانی
رہ جاتی تھی ہر موج تڑپ کر لبِ دریا

اک سمت فقط چند نقوشِ دو دو پیاسے
اک سمت ہزاروں کا یہ لشکر لبِ دریا

وہ سر دمِ زاجوں کے مظالم سرِ میداں
وہ گرمیِ ہنگامۂ محشر لبِ دریا

مشکیزۂ بے آب علمدار کی روداد
کچھ برلب، رہے کچھ برلبِ دریا

کس دل سے سُنے انکی مصیبت کوئی اے جوشؔ
پیاسے میں جو مر جائیں تڑپ کر لبِ دریا

جوش ملیانی

اسی سلسلے میں دو مزید سلام بھی ملاحظہ کر لیجیے۔ ایک تو بالکل پرانے ڈھنگ کا ہے، دوسرا جدید طرز کا۔ اب قدیم طرز کا سلام جناب جوش ملیانی سے سنیئے اور یہ ملحوظ خاطر رہے کہ یہ ایک غیر مسلم موحّد محبّ آلِ محمدؐ کا کلام ہے :-

لو آ گئے عبّاسِ دلاور لبِ دریا ۔۔۔ لو تیغ عدو رہ گئی کٹ کر لبِ دریا
پانی بھی کسی کو نہ دیا اہلِ ستم نے ۔۔۔ پیاسے تھے بہتّر کے بہتّر لبِ دریا
گرداب بھی اعدا سے یہ کہتے تھے بہ آواز ۔۔۔ جلتا ہے یہ تقدیر کا چکّر لبِ دریا
کیا تشنگیٔ شوقِ شہادت تھی کہ عبّاس ۔۔۔ پیاسے ہی پلٹ آئے پہنچ کر لبِ دریا
دشمن کی صفیں درہم و برہم تھیں کچھ ایسی ۔۔۔ شبّیر پہنچ جاتے تھے اکثر لبِ دریا
اس غم سے کہ بچوں کو بھی ملتا نہیں پانی ۔۔۔ رہ جاتی تھی ہر موج تڑپ کر لبِ دریا
اک سمت فقط چند نفوس اور وہ پیاسے ۔۔۔ اک سمت ہزاروں کا یہ لشکر لبِ دریا
وہ سرد مزاجوں کے مظالم سرِ میداں ۔۔۔ وہ گرمیٔ ہنگامۂ محشر لبِ دریا
مشکیزۂ بے آب علمدار کی روداد ۔۔۔ کچھ بر لبِ شو فاد ہے کچھ بر لبِ دریا
کس دل سے سنے ان کی مصیبت کوئی اے جوش

جمیل مظہری

اب یہ نئے ڈھنگ کا سلام ملاحظہ ہو۔

(بہ طرزِ مثلث)

سلام اے مطلبِ ذبحِ عظیم و فدیۂ عظمیٰ ۔۔۔ سلام اے کشتۂ نازِ خدائے عیسیٰ و یحییٰ
سلام اے حجّتِ مطلق سلام اے آیتِ کبریٰ

سلام اے لفظِ خودداری کہ معنی بخشنے والے ۔۔۔ ارادوں کو تصور کی بلندی بخشنے والے
دلِ احرار کو ہمت کی گرمی بخشنے والے

سلام اے ساربانِ ناقۂ حرّیت ۔۔۔ ترا ہر نقشِ پا مستقبلِ دنیائے حرّیت
ترے ماضی کے آئینہ میں ہے فردائے حرّیت

عرب کی دھوپ تھی اور بے نوا بانی تھا عالم پر ۔۔۔ مگر تھا عزم راسخ خندہ زن حالاتِ حاضر پر
سلام اے اوجِ اعظم حکمراں تھی تو عناصر پر

جہادِ نفس بھوک اور پیاس میں پا کیا تو نے ۔ پسر کی لاش پر بھی شکر کا سجدہ کیا تو نے
سرِ انسانیت کو کس قدر اونچا کیا تو نے

سیاست کو عمل کا ایک نیا جامہ دیا تو نے ۔ کہ نبضِ دعوت میں اپنا لہو دوڑا دیا تو نے
زمانہ چونک اٹھا غفلت سے وہ جھٹکا تو نے

جہاں ہے آج تک ممنون تیری تشنہ کامی کا ۔ اتارا دوشِ انساں سے جوا تو نے غلامی کا
ملا مٹی میں سارا طنطنہ فرعون نامی کا

خوشا وہ چشمِ باطن جس نے فتنوں کو جری دیکھا ۔ رسول اللہ کے منبر کو تختِ قیصری دیکھا
ضمیرِ سنگ میں رقصِ بتانِ آذری دیکھا

اگرچہ بت پرستی کا نہ تھا سودا دماغوں میں ۔ مگر اک بتِ ملوکیت کا باقی تھا دماغوں میں
بسی تھی سطوتِ شاہانۂ کسریٰ دماغوں میں

سنہ اکسٹھ میں اچانک وہ طلسمِ خودسری ٹوٹا ۔ تری ضربِ کلیمی سے فسونِ سامری ٹوٹا
بتانِ آذری ٹوٹے، غرورِ قیصری ٹوٹا

اصولوں کے لئے جو کچھ تھا قرباں کر دیا تو نے ۔ گراں جنسِ عمل تھی، خون ارزاں کر دیا تو نے
مذاقِ حریت کو جزوِ ایماں کر دیا تو نے

سیاست کو مذاقِ عشق کی دی چاشنی تو نے ۔ بدل ڈالا مزاجِ خود پسندِ رہبری تو نے
حیات و موت میں رشتہ لگایا معنوی تو نے

ملی سینہ بہ سینہ گرمیِ سوزِ نہاں تجھ کو ۔ مشیت نے بنایا اپنے دل کا ترجماں تجھ کو
دہانِ زخم سے لینا پڑا کارِ زباں تجھ کو

دکھانا تھا کہ حدِ صبرِ انسانی کہاں تک ہے ۔ مزاجِ آب و گل میں زورِ روحانی کہاں تک ہے
بہ خاکستر امینِ نورِ یزدانی کہاں تک ہے

ترا پیغام کیا داغِ جگر ہے محفل افروزی ۔ سرافرازی، دل افروزی، جہاں سازی جگر سوزی
شکستِ فاش سے لینا خراجِ فتح فیروزی

سلام اس دل پہ جو مضطر نہ تھا بچوں کے شیون سے ۔ پگھل جاتا تھا لیکن معرکے میں حالِ دشمن سے
ملی مستقبلِ انسان کی آہٹ بھی دھڑکن سے

ہوئی روشن دلِ شاعر میں جب یہ شمعِ آزادی
زبانِ حال سے اس خون کا ہر قطرہ ہے فریادی
سُن اے حلقہ بگوشِ دینِ نمرودی و شدادی

سلام اس خونِ ناحق پر حدیثِ دلگشا جس سے
ستمبر بانوں کی تاریخِ سیاست سُرخ رو جس سے
رگِ احساس میں کھولا حمیّت کا لہو جس سے

جو ٹپکا حلقِ اصغر سے، قسم ہے حلقِ اصغر کی
حکومت بہہ گئی دھاروں میں جس خونِ مطہر کی
جو قرباں گاہ پر تھا نذرِ آخر اک پیمبر کے گھر کی

ہوئی رنگین ریشِ پاکِ شاہِ دوسرا جس سے
چمک اٹھی جبینِ فخرِ ختم الانبیا جس سے
ہوئی مضمون سُرخی داستانِ کربلا جس سے

سلام اے فدیۂ حق، خون رونے آسماں تجھ پر
بہائے اشکِ ماتم ہر محرم میں جہاں تجھ پر
یونہی ہر سال صدقے ہو، حیاتِ جاوداں تجھ پر

وحید اختر ایک اور نظم نما مرثیہ وحید اختر سے سنئے جس میں واقعاتِ کربلا حالاتِ حاضرہ سے مربوط کر دیئے گئے ہیں۔ اس کی سرخی ہے۔

جشنِ عزا

تمام روز رہا گرم عرصۂ پیکار
جھلستا دشتِ الم، آفتابِ آتش بار
زمین آگ کا دریا، فرات صرف سراب
حقیقتاً بدی تیغ و تیر و خنجر و جار
تمام روز رہا العطش کا ہنگامہ
گرسنگی ہی میں گزرے تھے کتنے لیل و نہار
تمام دن رہے پیاسے، بسیر خوک و شغال
ستم رسیدہ رہے عہد ساز و حق آثار
تمام روز اڑی گردبادِ اسپاں سے
تپتی دھوپ میں بھی دوپہر تھی تیرہ و تار
تمام روز بجا فتحِ ظلم کا ڈنکا
جو تا مرگ ہوئی ہمت زمانہ شکار
تمام روز رہا حدِّ ضبط میں بیتاب
کسی یتیم کا آنسو، کسی جگر کا قرار
تمام روز ہوا نرغۂ عدو میں تباہ
کسی دلہن کا سہاگ اور کسی ضعیف کا پیار
تمام روز رہا خشک ماں کا دودھ مگر
گلے لپٹ کے بنا ایک تیر دودھ کی دھار
تمام روز رہی کشتگاں کی آمد و رفت
جو ایک لاش اٹھی دوسری ہوئی تیار

تمام روز رہے منتظر کسی کے لئے — سر سنان، خم شمشیر اور لب سوفار
تمام روز بھٹکتے قلب، ترستی آنکھیں — تمام روز رہا زخم و داغ دل کا شمار
جو دن تمام ہوا، تیرگی کے ڈیرے میں — سکوت شام غریباں کا زہر پھیل گیا
بڑھا اندھیرا تو چمکے سر مژہ مہتاب — اُجلے سوئے تو خوابیدہ درد جاگ اٹھا
ہزاروں خوں شدہ یادیں، ہزاروں زخمی خواب — نظر جھکائے نہ جانے کہ ڈھونڈتے ہیں کیا
جلی قنات، عطش، بھوک، درد نومیدی — اندھیری رات میں لاکھوں کا شہر ہے صحرا
ذرا سی دور، کہیں جشن گاہ فاتح میں — شراب و شاہد و عیش و نشاط کا ڈیرا
کسی کے قلب میں پھوٹی ذرا سی نور کی دھار — کسی نے ڈرتے ہوئے غم زدوں کا ذکر کیا
بڑے جتن سے ہوا اہتمام آب و طعام — چراغ شام غریباں لب فرات جلا
ہمارے شہر میں بھی یوں ہی عید آتی ہے — کہ جیسے گنج شہیداں میں جل اٹھا ہو دیا
ہماری بزم میں اس طرح لوگ ہنستے ہیں — وفور کرب میں جس طرح خندہ ہائے بیجا

ہمارے عہد میں یوں روز جشن آتا ہے
کہ جیسے شمر ہو آکر شریک بزم عزا

قبل اس کے کہ ہم واقعات کربلا سے متعلق مرثیوں کی بحث کو ختم کریں، نامناسب نہ ہوگا۔ اگر ناظرین ماہر لسانیات، انگریزی کے پروفیسر اور سابق وائس چانسلر الٰہ آباد یونیورسٹی پنڈت امرناتھ جھا صاحب کی گرانقدر رائے اپنے مراثی کے متعلق ملاحظہ کریں۔ وہ مراثی شاد عظیم آبادی کے پیش لفظ میں یوں رقمطراز ہیں:-

ڈاکٹر امرناتھ جھا کی رائے

"تاریخ اردو شاعری میں کوئی واقعہ شہادت حسین سا اثر انگیز اور رقت آمیز دیرپا نقش نہیں چھوڑ گیا۔ صدیوں قبل یہ واقعہ ہندوستان سے دور دراز ملک عرب میں وقوع پذیر ہوا۔ لیکن محرم میں سال بہ سال اس کی یاد اس طرح تازہ ہو جاتی ہے کہ اس خونی واقعہ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ واقعہ کا اجمالی اختصار یہ ہے۔ حسین اور یزید کی مخالفت، اول الذکر کا ترک وطن کرنا، میدان کربلا میں ساہر

چہار طرف سے محصور ہونا، یزید کے فوجی سپاہیوں کے گوناگوں مظالم، پانی کا بند ہونا۔ اور چند در چند صبر آزما تشدّد آمیز جور وجفا، ادھر ناحق کے آگے سر نہ جھکانا با صبر واستقلال مصائب کا مقابلہ اور بالآخر شہادت اس واقعہ کے متعلق ہمارے ملک میں بے شمار نظمیں لکھی گئیں، جن میں مرثیے، واسوخت اور نوحے اس طرح مل جل گئے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنا چنداں آسان نہیں۔ دوسری زبانوں کے متعلق مجھے چنداں علم نہیں۔ لیکن واقعاتِ کربلا پر اردو کے علاوہ بنگلہ اور تیلگو میں بھی میں نے نظمیں پڑھی ہیں۔ اردو میں بیشک بے شمار نظمیں لکھی گئی ہیں۔ بدقسمتی سے مرثیہ ادبی اور لسانی زاویہ نگاہ سے کم دیکھا گیا، بلکہ فرقہ دارانہ نظر سے، یعنی اس کا معیار شاعری فرقہ دارانہ رہا نہ کہ ادبی اور فنی۔ یہ عموماً شیعہ حضرات کے جذبات کے اظہار کا آئینہ بنا رہا۔ عام طور پر شیعہ حضرات شعرا نے اس صنف سخن میں زیادہ قوت فکر خرچ کی اور مسلمانوں کا یہی فرقہ واقعتاً اس سے زیادہ متاثر رہا لیکن میں نے غیر شیعہ اور غیر مسلم شعرا کو بھی اس سے کافی متاثر دیکھا ہے۔

تاریخی نقطۂ نظر سے بعض ناقدین نے ان واقعات کی تردید کی ہے۔ جو انیس اور دبیر کے سے شعرا نے اپنے مراثی میں نظم کئے ہیں یعنی ان کی روایات منظومہ کی حمایت تاریخی شواہد نہیں کرتے۔ یہ تنقید یقیناً تمام داستان اور ڈرامے کی اہمیت کو تاریخی نقطۂ نظر سے باقی نہیں رکھتی۔ اس مقام پر ارسطو کے لفظوں کا اعادہ کیا جاتا ہے۔

"شاعر کی دنیا یہیں تک محدود نہیں کہ وہ چیزوں کو اسی طرح بیان کرے جیسی کہ وہ واقعی ہیں، بلکہ جو واقع ہو سکتی ہیں یا جن کا واقع ہونا نتیجے کی رو سے ممکن الوقوع یا ضروری ہے۔"

لہ مولف کے محدود علم میں واقعہ کربلا سے متعلق مرثیے اور نظمیں۔ عربی، فارسی، ریختہ، سندی، گجراتی، مرہٹی، کشمیری، پنجابی، تلگو، تامل، تقریباً تمام ہندوستانی زبانوں میں ہیں۔ مغربی زبانوں میں بھی انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں نظمیں ہونے کا اسے علم ہے۔ حسینی۔

ثانیاً غم انگیز نظموں کی حیثیت سے ناقدین نے مرثیوں کی یہ بھی تنقید کی ہے کہ ان میں بہت سے خارجی واقعات شامل کر دیئے جاتے ہیں۔ جن سے شدّت غم بیجا کی محسوس ہونے لگتی ہے اور مصائب و شہادتِ حسین کی طرف سے ذہنی دوسری طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

آیئے دیکھیں کہ دوسری زبانوں میں ایسی غم انگیز نظموں کے لکھنے کا کیا اسلوب رہا ہے (Mahaffy) اپنی تصنیف گرامر آف گریک لٹریچر میں لکھتا ہے کہ وہ یونانی زبان کی غم انگیز نظموں میں گوناگوں مضامین بیان کئے جاتے ہیں۔ مثلاً شاعر کے اہل وطن جو لڑائیاں لڑ رہے ہیں۔ اس کے اہل وطن کے درمیان سیاسی کشمکش، وہ اصول و ضوابط جن کی پابندی شاعر کے خیال میں ناگزیر ہے۔ اس دور کے اخلاق اور رسم و رواج کے متعلق شاعر کا ذاتی نظریہ، بہترین طریقے پر زندگی بسر کرنے کے متعلق اس کے خیالات، مسرت، بہ داماں دعوتیں، مرحوم کی موت پر اظہار غم اور وہ ہر چیز جس کے متعلق شاعر اور اس کے احباب سوچتے یا گفتگو کرتے ہیں۔

"ہم اپنی توجہ ملٹن کی نظم لسی ڈاس (Lycidas) کی طرف منتقل کریں، جہاں شاعر صرف نغمہ بداماں آنسوؤں کی حد پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے عہد کے بدوضع پادریوں کے خلاف ملامت آمیز تقریروں سے ان کی توہین بھی کرتا ہے کہ "بیاید زگرگ چوپانی" ٹنی سن اپنی نظم میموریم (Memoriam) میں ہیلم (Hallam) کی موت کا ماتم کرتا ہے لیکن بلند فلسفیانہ سوالات، مذہبی شکوک حسین اور دلکش مناظر فطرت اور اہل کلٹ (Celt) کی تقلیدی وحشیانہ بیتھو آرنلڈ کلف کی رحلت کی نوحہ خوانی کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ اپنے پیارے وطن کے خیالی عروج سے بھی دلچسپی کا اظہار کرتا جاتا ہے۔ پھر صرف اردو مراثی کے خلاف کیوں یہ شکایت روا رکھی جاتی ہے۔ کہ ان میں بہ بسط و شرح تلواروں گھوڑوں اور رسومات شادی کے بیانات کیوں ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ خارجی اسباب کو۔ نظرانداز کرتے ہوئے اصل مضمون بلا شک و ریب غم اور ماتم سے تعلق رکھتا ہے۔

اور ذہن اسی مرکزِ غم پر جاکر ٹھہر جاتا ہے"۔[1]

افسوس ہے کہ اُردو مرثیہ پر اسقدر توجہ نہیں کی گئی جس کا وہ مستحق ہے اس میں شاعرانہ کمالات اور زبان و بیان کی جتنی خوبیاں ہیں وہ سب پائی جاتی ہیں۔ اور اس کا موضوع ایسے اخلاقِ حمیدہ اور اوصافِ جلیلہ کی تعلیم دیتا ہے جو انسانیت کا شرف ہیں۔ ضرورت ہے کہ علامہ شبلی نے جو شمع اپنے موازنہ کے ذریعے روشن کی تھی اسے بجھنے نہ دیا جائے۔ مخصوص مرثیہ گویوں پر الگ الگ ناقدانہ نظر ڈالنے کے ساتھ اپنے ادب کے اس خزانے کو اچھی طرح دیکھا اور پرکھا جائے اور اس کے مطالعے کے بعد اس کے ترجمے مختلف زبانوں میں کئے جائیں تاکہ دوسری زبانوں کے ادیب و ناقد بھی ہمارے اس گرانمایہ لعلِ ہندوستان سے اپنی دیدہ ور آنکھیں روشن کرسکیں۔ اور ہماری اس ایجاد کو عالمی و آفاقی ادب میں اس کا صحیح مقام مل سکے۔

---

[1] "مراثی شاد عظیم آبادی": مقدمہ

چوتھا باب

دیگر اقسام مرثیہ

اردو میں مرثیے صرف واقعات کربلا اور ائمہ و اولیاؤں کی شہادتوں پر اظہار غم ہی تک محدود نہیں بلکہ اس میں شخصی اور نجی غم کے مرثیے بھی کافی تعداد میں موجود ہیں اور ان کی تعداد میں موجود ہیں۔ اور ان کی تعداد میں بھی روز بہ روز بڑھتی جاتی ہے۔ غالب نے عارف کے مرنے پر جو غزل میں اس پر آنسو بہائے ہیں یا اپنی ایک محبوبہ کا ماتم کیا ہے۔ ان سے شخصی مرثیوں کی ایک طرح بنیاد پڑ گئی۔ خود حالی نے غالب کی وفات پر جو مرثیہ کہا ہے وہ ادب کا ایک کارنامہ ہے اور مؤلف کی حقیر رائے میں حالی کی شاعرانہ تخلیقات میں دریگانہ۔ پھر چکبست نے مختلف رہبران قوم پر جو مرثیے لکھے ہیں اور ان میں حسن و خوبی و فنکاری سے ان کے کردار و سیرت کی حقیقی اور سچی تصویریں پیش کی ہیں وہ اردو زبان کے لیے مستحق صد افتخار ہیں۔

ان چند روحوں کے بعد ایک سلسلہ سے بلا مبالغہ سیکڑوں مرثیے مختلف قائدوں اور مدبروں اور سیاسی رہنماؤں یا عزیزوں، قرابتداروں اور دوستوں کی موت پر کہے گئے ہیں۔ مہاتما گاندھی و محمد علی جناح، جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، لال بہادر شاستری کے قتل و وفات پر ایک سے ایک بہتر مرثیے لکھے گئے ہیں۔

چند اقتباسات جو عام طور پر نظروں سے نہ گذرے ہونگے مثلاً پیش ہیں۔

ڈاکٹر اقبال (والدہ)

ذرہ ذرہ دہر کا زندانی تقدیر ہے — پردۂ مجبوری و بے چارگی تدبیر ہے
آسماں مجبور ہے، شمس و قمر مجبور ہیں — انجم سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں
ہے شکست انجام غنچے کا سبو گلزار میں — سبزہ و گل بھی ہیں مجبور نمو گلزار میں
نغمۂ بلبل ہو یا آواز خاموش ضمیر — ہے اسی زنجیر عالمگیر میں ہر شے اسیر
آنکھ پر ہوتا ہے جب یہ سر مجبوری عیاں — خشک ہو جاتا ہے دل میں اشک کا سیل رواں

قلبِ انسانی میں رقصِ عیش و غم رہتا نہیں
نغمہ رہ جاتا ہے لطفِ زیر و بم رہتا نہیں!

علم و حکمت رہزنِ سامانِ اشک و آہ ہے
یعنی اک الماس کا ٹکڑا دلِ آگاہ ہے

گرچہ میرے باغ میں شبنم کی شادابی نہیں
آنکھ میری مایہ دارِ اشکِ عنابی نہیں

جانتا ہوں آہ! میں آلامِ انسانی کا راز
ہے نوائے شکوہ سے خالی میری فطرت کا راز

میرے لب پر قصۂ نیرنگیِ دوراں نہیں
دل مرا حیراں نہیں، خنداں نہیں، گریاں نہیں

پر تری تصویر قاصد گریۂ پیہم کی ہے
آہ! یہ تردید میری حکمتِ محکم کی ہے!

گریۂ سرشار سے بنیادِ جاں پایندہ ہے
درد کے عرفاں سے عقلِ سنگدل شرمندہ ہے

موجِ دودِ آہ سے آئینہ ہے روشن مرا
گنجِ آب آورد سے معمور ہے دامن ترا

حیرتی ہوں میں تری تصویر کے اعجاز کا
رخ بدل ڈالا ہے جس نے وقت کی پرواز کا

رفتہ و حاضر کو گویا   اس نے کہا
عہدِ طفلی سے مجھے پھر آشنا اس نے کیا

جب ترے دامن میں پلتی تھی وہ جانِ ناتواں
بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زباں

اور اب چرچے ہیں جس کی شوخیِ گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشمِ گوہر بار کے

علم کی سنجیدہ گفتاری، بڑھاپے کا شعور
دنیوی اعزاز کی شوکت، جوانی کا غرور

زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم
صحبتِ مادر میں طفلِ سادہ بن جاتے ہیں ہم

بے تکلف خندہ زن ہیں، فکر سے آزاد ہیں
پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ! میرا انتظار
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بیقرار

خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

(ب) مرثیہ بر وفات سر راس مسعود

یہ مہر و مہ، یہ ستارے، یہ آسمانِ کبود
کسے خبر کہ یہ عالم عدم ہے کہ وجود

خیالِ جادہ و منزل، فسانہ و افسوں!
کہ زندگی ہے سراپا رحیلِ بے مقصود

رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی!
وہ یادگارِ کمالاتِ احمد و محمود

زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اس کی
وہ کارواں کا متاعِ گراں بہا مسعود

مجھے رلاتی ہے اہلِ جہاں کی بے دردی
فغانِ مرغِ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود

نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غمِ دوست
نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود

دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
ز عشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است

نہ پوچھ مجھ سے کہ عمرِ گریز پا کیا ہے
کسے خبر کہ یہ نیرنگ سیمیا کیا ہے

ہوا جو خاک سے پیدا وہ خاک میں مستور
مگر یہ غیبتِ صغریٰ ہے یا فنا کیا ہے؟

غبارِ راہ کو بخشا گیا ہے ذوقِ جمال
خرد بتا نہیں سکتی کہ مدعا کیا ہے

دل و نظر بھی اسی آب و گل کے ہیں اعجاز
نہیں، تو حضرتِ انساں کی انتہا کیا ہے

جہاں کی روحِ رواں لا الٰہ الا ھو
مسیح و چلیپا یہ ماجرا کیا ہے

قصاصِ خونِ تمنا کا مانگیے کس سے
گناہ گار ہے کون اور خوں بہا کیا ہے

غمیں مشو کہ بہ بندِ جہاں گرفتاریم
طلسمہا شکند آں دلے کہ ما داریم

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات

خودی ہے زندہ تو دریا ہے بیکرانہ ترا
ترے فراق میں مضطر ہے موجِ نیل و فرات

خودی ہے مردہ تو مانندِ کاہ پیشِ نسیم
خودی ہے زندہ تو سلطانِ جملہ موجودات

نگاہ ایک تجلی سے ہے اگر محروم
دو صد ہزار تجلی تلافیِ مافات

مقامِ بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر!
زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات

حریمِ ذات ہے اس کا نشیمنِ ابدی
نہ تیرہ خاکِ لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات

خود آگہاں کہ ازیں خاکداں بروں جستند
طلسمِ مہر و سپہر و ستارہ بشکستند

(ج) جسٹس شاہ دین مرحوم

اے ہمایوں! زندگی تیری سراپا سوز تھی!
تیری چنگاری چراغِ انجمن افروز تھی!

گرچہ تھا تیرا تنِ خاکی نزار و دردمند
تھی ستارے کی طرح روشن تری طبعِ بلند!

کس قدر بیباک دل اس ناتواں پیکر میں تھا
شعلۂ گردوں نورد اک مشت خاکستر میں تھا!

موت کی لیکن دلِ دانا کو کچھ پروا نہیں — شب کی خاموشی میں جز ہنگامۂ فردا نہیں

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی!
ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی!

احسان دانش

ایک اور ذاتی اور نجی غم کا مرثیہ ملاحظہ ہو۔ احسان دانش نے اپنی بہن فاطمہ کے مرنے پر یوں آنسو بہائے ہیں۔

زندگی ہستیِ انساں کا اختتام نہیں! — شاید اس صبحِ کشاکش کی کوئی شام نہیں
فاطمہ! اب جو کیا تو نے جہاں سے پردہ — دل کو تسکین نہیں، روح کو آرام نہیں
تیری تصویر ہے دیوانِ تصور کی بہار — گرچہ الفاظ کی صورت میں ترا نام نہیں
تیرے معصوم یتیموں کا محافظ ہے خدا — خالی حکمت سے مشیت کا کوئی کام نہیں

تیری الفت کا ہوں قائل مرے خوابوں میں نہ آ
جانتا ہوں تری تعمیرِ وفا خام نہیں!

غم نہ کھا اور بس اب مجھ کو مرے حال پہ چھوڑ — کیوں تجھے گوشۂ تربت میں بھی آرام نہیں
ہر نفس مجھ کو تری سمت لیے آتا ہے — جاودانی یہ قفس خانۂ اجسام نہیں!
ایک محور پہ نظامِ سحر و شام تو ہے — ایک مضمون حدیثِ سحر و شام نہیں!
تیری راتوں کے تقدس میں نہیں انوارِ سحر — میری صبحوں کے تصور میں بھی شام نہیں

خواہشِ مرگ جوانی میں کیے جاتا ہوں
زندگی زہر ہے مجبور پیے جاتا ہوں

صفی لکھنوی

مرثیہ مولانا حالی

اس بزم میں آ کے جانے والا! — پھر جا کے ادھر نہ آنے والا!
کھوٹوں کو کھری سنانے والا — اے قوم ترا جگانے والا!
خاموش لحد میں سو رہا ہے!
اور اس کو زمانہ رو رہا ہے

سعدی، عطّار اس صدی کا | طینت میں اثر نہ تھا بدی کا
دل آئینہ عشق سرمدی کا | بتلا خلقِ محمدی کا

تھا حسنِ عمل سے جس کو رشتہ

قالب میں بشر کے اک فرشتہ

سلطانِ قلمرو خیالی | اقلیمِ سخن کا بابِ عالی
بے مثل، مثالِ بے مثالی | شمس العلماء جناب حالی

ذی عزّت و خواجۂ گرامی!

الطاف حسین نام نامی!

کس بحرِ سخن کا آگیا نام | بے تاب ہے مدّو جزرِ اسلام
وہ نظمِ مسدس، ابرِ انجام | بارانِ گہر کی ریزشِ عام

راتیں نذرِ سخنوری کیں

سو کھی ہوئی کھیتیاں ہری کیں

تھی قوم سے الفت انتہا کی | قومی نظموں کی ابتدا کی
آرائشِ نقشِ مدّعا کی | رحمت مرحوم پہ خدا کی

دل میں حالی زباں پہ حالی

حالی کی جگہ مگر ہے خالی

سنجیدہ کلام نغمۂ راز | اندوہ رُبائے طبعِ ناساز
سیدھا سادہ وہ اس کا انداز | تھا سحرِ حلال، بلکہ اعجاز

پھونکی وہ سخن میں اک نئی رُوح

زندہ ہوئے پھر قلوبِ مجروح

وہ خضرِ ادب، ادیبِ مشتاق | فرخندہ سیر، لبیبِ اخلاق
یکتائے زماں، وحیدِ آفاق | گر نظم میں فرد، نثر میں طاق

پاکیزہ خیال و پاک طینت!

جس بزم میں ہو وہاں کی زینت

ختم اس پہ تھی واقعہ نگاری تھا نظم میں لطفِ نثر سازی!
ہر گوشہ میں فیض اسی کا جاری ہر کشت رہینِ آبیاری!
اندوہ رُبا نشاطِ اُمید
فرحت افزائے حیاتِ جاوید
پایا تھا دماغ شاعرانہ نباضِ طبیعتِ زمانہ!
ڈھونڈھا کرتا تھا اک بہانہ سعدی کا لکھ دیا فسانہ!
کہتے ہیں جسے حیاتِ سعدی!
مجموعۂ واقعاتِ سعدی!
مرحوم تھے یادگارِ غالب تلمیذِ وفا شعارِ غالب
دم سے ان کے بہارِ غالب روشن شمعِ مزارِ غالب
بے بادہ ہوا ایاغ، افسوس!
گل ہو گیا اب چراغ، افسوس!
بحرِ ہستی کے پار پیراک پانی پت میں اڑاد ہے خاک
چکر کھایا کریں اب افلاک ملتا ہے کہیں وہ گوہرِ پاک
لیتا ہے زمانہ، آہ جیسے!
دیتا نہیں، کیا ستم ہے ویسے!
دنیا کا یہی ہے عام دستور ہم بزم ہوں رفتہ رفتہ سب دور
سید کے جو نورتن ہیں مشہور جن میں اک فرد ذاتِ مغفور!
سب نذرِ اجل ہوئے وہ گوہر
کھلا گئے اپنے اپنے جوہر
تھا میکدہ جس جگہ وہیں ہے! لیکن پیرِ مغاں نہیں ہے!
ساغر ہے کہیں تو شیشہ کہیں ہے! دل ورطۂ غم میں تہ نشیں ہے!
قومی وہ جہاز سارے ڈوبے
ڈوبا چاند اور تارے ڈوبے

ہر چند سبھی یہ نامور تھے رفقائے جہاں سے باخبر تھے!
آزادہ روی کے راہبر تھے گویا چراغِ رہ گزر تھے

خواجہ نیکن سبھوں میں حکّل تھا!
بانی تھا مزاج، صُلحِ کُل تھا!

دل خون کیا جب اس خبر نے! آنسو برسائے چشمِ تر نے
دل سے درخواست کی جگر نے لکھی یہ صفیؔ نوحہ گر نے

"تاریخِ وفاتِ خواجہ حالیؔ
ہستی حالی سے اب ہے خالی"

اقبال سہیل

مرگِ حیات آفریں — (مرثیہ محمد علی جوہر)

گل کدۂ روزگار سیر کے قابل نہیں اسکی حقیقت ہے زہر، اس کا مجاز انگبیں
لالۂ رنگیں پرند، شاہدِ آتش نشیں سنبلِ مشکیں کمند، عارضِ آستیں

قامتِ سرو بلند مصرعِ آہ حزیں

فہم سے ہے ماورا بزمِ جہاں کا نظام تلخی آلام سے اس کا ہے لبریز جام
میکدۂ دہر میں کون نہیں تلخ کام خونِ شقائق سے ہے رنگ زمیں لالہ فام

زخمِ کواکب سے چور سینۂ چرخِ بریں

شوکتِ دارا و جم قصۂ ماضی سہی کل کی ابھی بات ہے فرمانِ الٰہی
مٹ گئی اک آن میں زار کی شہنشہی وارثِ عثمان سے چھن گئی تختِ خلافت تہی

مسندِ قاچار پر اب ہے رضا خاں مکیں

جائے تحیر نہیں دہر کا یہ انقلاب موجۂ ہستی ہے خود سلسلۂ پیچ و تاب
جلوۂ نیرنگ ہے حسنِ ازل کی نقاب اصل میں ہیں ورنہ ایک قطرہ، موج و حباب

شانِ مظاہر ہے صرف گاہ چناں گہ چنیں

جلوۂ ہستی ہے کیا صرف فریبِ سراب زندگیِ مستعار کیا ہے بس ایک نقش آب
اسکی حقیقت عدم، اسکا وجود اضطراب خواب ہے یہ زندگی موت ہے تعبیرِ خواب

زندگی اک وہم ہے، موت ہے حق الیقیں

حق و صداقت پہ ہے جس کا قدم استوار خدمتِ ملک و وطن، جس نے بنایا شعار
شیوۂ اہلِ یقیں جس نے کیا اختیار ملت و دیں پر کئے جس نے دل و جاں نثار

ایسا شہید وفا مر کے بھی مرتا نہیں

ایسی ہی موتیں تو ہیں قابلِ صد احترام جو کہ بدلتی ہیں بزمِ جہاں کا نظام
دیتی ہیں جو روح کو عالمِ جاں کا پیام بھرتی ہیں افراد میں ولولۂ جوشِ عام

دیتی ہیں اقوام کو پھر سے حیاتِ نویں

ایسی شہادت تو ہے زیست کا مقصودِ عین — ایسی شہادت کی ہے بے ادبی شور و شین
شیوۂ مرداں نہیں ماتم و فریاد و بین — ایسی شہادت تو ہے ارثِ علی و حسین
جس کو یہ دولت ملی اُس پہ ہزار آفریں

آہ محمد علی، آہ شہیدِ وطن — زبدۂ اہلِ کمال مرجعِ اربابِ فن!
چھوڑ کے تو چل دیا دہر کا دار المحن — ملتِ اسلام کی سوتی ہوئی انجمن
خیر، مبارک تجھے سیرِ بہشتِ بریں

پاک گہر پاک باز، زندہ دل و زندہ ساز — مستِ شرابِ حجاز، شمعِ شبستانِ راز
مرکزِ صد عز و ناز غازیِ گردن فراز — خامہ گرِ جاں نواز، ناثرِ جادو طراز
نظم تری جاں گداز، نثر تری دل نشیں

یوں تو ہر اک شب کو صبح گہ حشر تک — شوق سے ہوگا طلوع شاہِ سریرِ فلک
کون ہوں محوِ فغاں آج سما تا سمک — آہ نہ دکھلائے اب کبھی اپنی جھلک
غرب میں ڈوبا ہے جو مشرقی مہرِ مبیں

عازمِ مغرب ہوا چھوڑ کے ملک و دیار — شہدِ ملت پہ کی جانِ گرامی نثار
قلزمِ انوارِ قدس تجھ پہ رہا شعلہ بار — شامِ غریباں کی ہے صبحِ وطن آشکار
ملتی ہے ہر شخص کو ایسی سعادت کہیں

تابدمِ مرگ کی خدمتِ ملک و وطن؟ — تلخیِ آلام بھی ہو نہ سکی دل شکن
مژدۂ ہمت بنی شدتِ رنج و محن — کر نہ سکا تجھ کو رام خطرۂ دار و رسن
ہاتھ سے چھوٹی نہیں دین کی حبل المتیں

ہاتھ میں لیکر اٹھا جب علمِ لا الٰہ — پاؤں سے ٹھکرا دیئے سب حشم و مال و جاہ
دیکھ تو یوں ہوتی ہے نبضِ ازل کی نگاہ — حق نے عطا کی تجھے کتنی بڑی بارگاہ
نام سے معمور ہیں تیرے زمان و زمیں

مطلعِ اسلام میں ذات تری آفتاب — عارضِ توحید کی تو نے کیا بے نقاب
سعی تری کامیاب، تیری دعا مستجاب — مسجدِ اقصیٰ میں ہے تیرا لحد محوِ خواب
گلشنِ لاہوت میں روح ہے مسند نشیں

جگن ناتھ آزاد

ماتمِ اقبال

پھر نالہ ہائے غم سے ہے لبریز دل کا ساز — پھر ہو گیا ہے دیدۂ حیراں گہر طراز
وہ حق شناس فلسفی و نکتہ داں — وہ باکمال شاعر و درویش پاکباز
نغمے تھے جس سخنورِ اعلیٰ دماغ کے — مشرق میں دلپذیر تو مغرب میں جاں نواز
تیرِ اجل نے اس کو نشانہ بنا لیا — تھا ہم کو آہ جس کے کمالِ سخن پہ ناز
محفل سے آج ساقیِ محفل ہی اٹھ گیا — آزاد اب کہاں وہ شرابِ جگر گداز

ہر بزم وقفِ نالۂ غم ہے ہزار حیف
خوں نابہ بار دیدۂ غم ہے ہزار حیف

اقبال اے جہانِ معانی کے تاجدار — اے رومی و سنائی و غالب کی یادگار
معنی کو تجھ پہ فخر، تخیل پہ تجھ کو ناز — نازاں تھا تجھ پہ مشرق و مغرب کا ہر دیار
آتش کا سوز، گل کی مہک، برق کی تڑپ — سو جان سے ہو گئے تری تخیل پر نثار
تو نے سخن کو زندۂ جاوید کر دیا — تیرے نفس نے دی چمنِ شعر کو بہار
دو گز زمین آہ تجھے راس آ گئی — شہرت پہ تیری تنگ تھا دامانِ روزگار

گو زیرِ خاک کالبدِ خاک آ گیا
تو روح بن کے عالمِ جاں میں سما گیا

اے مزرعِ سخن پہ برستے ہوئے سحاب — اے مطلعِ وطن کے درخشندہ آفتاب
جاں بخش تیری نظم کا ہر استعارہ ہے — ہر لفظ بے مثال ہے ہر شعر لاجواب
اب آ کے کون دے گا گلِ شعر کو مہک — بخشے گا کون گوہرِ معنی کو آب و تاب
کہتے ہیں ترجمانِ حقیقت بجا تجھے — ہر رازِ حق تھا دیدہ و باطن پہ بے نقاب
رتبہ تیری خودی کا بہت ہی بلند تھا — تجھ سے ترے خدا نے کیا بارہا خطاب

اس دور میں تو آگہِ رازِ قدیم تھا
جو ہو حریفِ جلوۂ حق، وہ کلیم تھا!

جس کی صداؤں پر ہمہ تن گوش تھے سروش — وہ جام روح پرور عرفاں کا بادہ نوش
جس کی نوائے نادر افغاں تڑپ اٹھا — اُف ہو گیا وہ شاعر آتش نوا خموش
رنگین تھا جس کے حسنِ تخیل سے دامنِ گل — جس کی گرج سے موجۂ طوفاں میں تھا خروش
سینوں میں جس نے قوت گفتار سے بھرا — صہبائے خودی کا سرور اور عمل کا جوش
تھا جس کی سانس سانس میں میخانۂ حیات — تربت ہے اس کی سایۂ مسجد میں سبز پوش

ہے خاک میں وہ عرش معانی ہزار حیف
اے انقلابِ عالمِ فانی ہزار حیف!

گوپی ناتھ امن

ماتمِ آزاد ۔ (مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقال پر ملال پر مرثیہ) :-

ہے ہر اک سمت سوگ کا عالم — چشمِ پیر و جواں ہوئی پُر نم
جس کو دیکھو وہ محوِ آہ و بکا — جس کو دیکھو رہینِ درد و الم
خاک بر سر ہیں، نم بخود ہیں سب — خاک میں کون چھپ گیا اک دم
پہلے گاندھی کو ہم سے چھین لیا — ڈھا دیا چرخ نے اب اور ستم
بھیگی آنکھوں میں درد ہے دل کا — زرد چہروں سے ہے عیاں ماتم

جیل نبا کون کس کا سوگ ہے یہ
کس کے محبوب کا بیوگ ہے یہ

سب اتار اور چڑھاؤ دیکھے تھے — سیکڑوں تاؤ بھاؤ دیکھے تھے
بگڑے انداز بھی تھے پیشِ نظر — اور بہت سے بناؤ دیکھے تھے
جن کا پرسان نہیں تھا اور کوئی — ان غریبوں کے گھاؤ دیکھے تھے
انتشارِ زمانہ دیکھا تھا — پیچ دیکھے تھے داؤ دیکھے تھے
جن میں انسانیت کا ایندھن تھا — چند ایسے الاؤ دیکھے تھے

مگر اللہ رے اس کا استقلال
شکر اللہ کا کیا ہر حال

دل میں سب تھے سیاسیات کے راز — اُس نے دیکھے تھے نشیب و فراز

دین میں، علم میں، سیاست میں — اس کو حاصل ہوئے بہت اعزاز

بجز اللہ اور کے آگے — نہ جھکائی کبھی جبینِ نیاز

فلسفی اس سے پوچھتے تھے رموز — اہلِ دیں اس سے پوچھتے تھے جواز

عالم و فاضل و مدبر کے — اس میں دیکھے گئے سبھی انداز

یوں تو خالی نہیں بڑوں سے جہاں

اس کے انداز اور ... میں ہیں کہاں

صبر اور ضبط کا وہ پارا تھا — زہر پینا اُسے گوارا تھا

جب ایسے بھی دور آئے تھے — آپ ہی اپنا وہ سہارا تھا

وہ یگانے بھی ہو گئے تھے خلاف — جن کو اغیار نے اُبھارا تھا

جسکے دم سے تھی دین کی رونق — منبروں سے اُسے اُتارا تھا

امتحانوں کی آنچ میں اُس نے — فطرتِ خاص کو سنوارا تھا

ہر طرح برنبا لیا، خود کو،

تپ کے کندن بنا لیا خود کو،

الہلال اک ہلال تھا بیشک — ادبِ لازوال تھا بے شک

کارنامہ تھا نثر کا لیکن — شاعری کا کمال تھا بے شک

ہر خیالِ بلند تھا اس میں — نہ کوئی ہم خیال تھا بے شک

جلسے جلسے میں تھی وہ کیفیت — قال میں لطفِ حال تھا بیشک

زندگی بخشی ملک و ملت کو — ہر جواب و سوال تھا بے شک

کیا ہو تعریف اس صحافت کی!

ہل گئیں سب جڑیں حکومت کی!

اس نے قرآن کی جو کی تفسیر — نہیں ملتی ہے اس کی کوئی نظیر

قابلِ احترام تھی ہر بات — قابلِ قدر اس کی ہر تحریر

کی وہ تشنہ ترک ... ادل — پھر گئے جس سے کافروں کے ضمیر

جن کو اللہ کے نام سے ضد تھی   وہ بھی سمجھے اُسے سمیع و بصیر
کتنی خوبی سے اس کو سمجھایا   کیا ہے تجسیم اور کیا تقدیر

وصفِ ربِ کریم سمجھایا
جادۂ مستقیم سمجھایا

فن عیاں ہے غبارِ خاطر میں   دل نہاں ہے غبارِ خاطر میں
سرسری جس نے پڑھ لیا سمجھا   داستاں ہے غبارِ خاطر میں
صاحبِ فہم و اہلِ دل کے لئے   اک جہاں ہے غبارِ خاطر میں
آپ اپنی مثال ہے کہ نہیں   جو بیاں ہے غبارِ خاطر میں
شوخی، بندش اور رنگینی   یہ بھی ہاں ہے غبارِ خاطر میں

ہے عجب یہ خطوں کا مجموعہ
ہے غضب یہ خطوں کا مجموعہ

سکتہ اہلِ ادب پہ طاری ہے   ایک آنسو کی دھار جاری ہے
ایک عالم میں دھوم تھی جس کی   ایک عالم کی سوگواری ہے
موت پر تو نہیں ملا قابو   نوحہ خوانی تو اختیاری ہے
یاد آتا ہے شوق کا مصرعہ   آج وہ کل ہماری باری ہے
یہی کہہ کے تھامتا ہے دل   موت سے کس کو رستگاری ہے

عالمِ باعمل کا ماتم ہے
فاضلِ بے بدل کا ماتم ہے

ملک کا ایک غمگسار گیا   ایک نہرو کا رازدار گیا
نہ مٹیں گے کبھی مٹانے سے   نقش ایسے وہ کچھ اُتار گیا
جو ودیعت کیا تھا خالق نے   دوش سے بار وہ اُتار گیا
کل جہاں کی تھی آخری تقریر   آج اسی جا تہہ مزار گیا
جس سے تھا علم کا وقارِ عظیم   آج وہ صاحبِ وقار گیا
چلتے چلتے کہا "خدا حافظ"   مرتے دم لب پہ تھا خدا حافظ

شمیم کرہانی

پرچم ظفر

(بہادر شاہ ظفر کی صد سالہ برسی کے موقع پر)

جس ہستیٔ عظیم کی چھیڑی گئی ہے بات — دی جس کے حوصلے نے غم زندگی کو مات
جس سے چھٹا نہ پرچم آزادیٔ حیات — روشن ہے آج جس کے لہو سے وطن کی رات

تھا باغباں جو گنگ و جمن کی بہار کا
وہ رہنے والا تھا اسی اجڑے دیار کا

جس کا بدن ضعیف تھا، دل سر بسر اُمنگ — جس آخری چراغ نے کی آندھیوں سے جنگ
شیشے نے جس کے توڑ دیے خنجر فرنگ — ان لال پتھروں میں ہے جس کے لہو کا رنگ

جو پا سکا قرار، نہ اس لالہ زار میں
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

وہ کاروان عشق و محبت کا سربراہ — وہ صلح کل، وہ ہندو و مسلم کا خیر خواہ
وہ شاہ قصر سرخ، وہ درویش خانقاہ — وہ سرزمین ہند کا بے تاج بادشاہ

گلشن اجاڑ ہو گیا فصل بہار میں
"کس کی بنی ہے عالم ناپائیدار میں"

ملت کا غم، تباہیٔ ہندوستاں کا غم — یار آشنا کا غم، پسران جواں کا غم
پھولوں کا غم، بہار کا غم، گلستاں کا غم — تھا اک دل غریب کو سارے جہاں کا غم

غم کتنے جھیلتا کوئی اس روزگار میں
اتنی جگہ کہاں تھی دل داغدار میں

رنگون میں اسیر تھا، اپنے وطن سے دور — جیسے زمیں پہ چاند پڑا ہو، گگن سے دور
تڑپا کیا وہ بلبل شیدا، چمن سے دور — دل کو ملا نہ چین کبھی انجمن سے دور

رویا کیا فراق کی شب ہائے تار میں
لگتا نہیں ہے جی مرا اجڑے دیار میں

پردیس میں بھی اس کا غم بے حساب تھا — کیسے چمن بچے گا، یہی اضطراب تھا

دلی ہی کا خیال، وطن ہی کا خواب تھا — گلشن سے دور منتظر انقلاب تھا
تھے چار دن ہی زندگیٔ نہریار میں
دو آرزو میں کٹ گئے، دو انتظار میں!

عرش ملسیانی

دیدہ ور

(پنڈت جواہر لعل نہرو کے انتقال پر)

یہ دنیا اپنی بدبختی و مقہوری پہ روتی ہے — یہ دنیا اپنی محرومی و مجبوری پہ روتی ہے
یہ دنیا آشتی و امن کی دوری پہ روتی ہے — "ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"

بہت ہوں گے رہے ہیں جن پہ الطافِ خداوندی — بہت ہوں گے سمجھتے تھے جو غمگینی کو خورسندی
بہت ہوں گے جنھیں آتا تھا آئینِ چمن بندی — بہت ہوں گے کرشمہ کار تھی جن کی ہنرمندی
کہاں ہوگا جواہر لال سا صاحب ہنر پیدا!

وہ البیلا مجاہد اور ساتھی اس کے البیلے — نہ بل ماتھے پہ آیا لاکھ قید و بند بھی جھیلے
شجاعت کے ہزاروں کھیل اس سادہ منش کھیلے — رہے بیخوف ہو کر جور و استبداد کے ریلے
کسی میں تاب یہ کب ہے کرے ایسا جگر پیدا!

ہوا وہ صاحبِ قلب و نظر اوجھل تو ہم روئے — غریبوں کو لگی اک چوٹ اربابِ حشم روئے
سیاستداں روئے، صاحبِ سیف و قلم روئے — کلیسا سے اٹھی اک چیخ اور دیر و حرم روئے
نہیں ہر روز ہوتا صاحبِ قلب و نظر پیدا

گل تازہ تھا، لیکن زندگی کاٹی ببولوں میں — بھلایا اس نے اپنی قوم کو عزت کے جھولوں میں
بسایا نخلِ آزادی کی ہر ڈالی کو پھولوں میں — بھرا تھا اس نے اک جادو اداؤں میں اصولوں میں
کیا تھا اس کی ہر اک بات نے جذب و اثر پیدا

زمانہ بھر کے رندوں کے لیے تھا اس کا میخانہ — سنایا اس نے سب کو امن و آزادی کا افسانہ
اسے کرتا تھا سجدہ کوئی اپنا ہو کہ بیگانہ — وہ عالم دوست محبوبِ جہاں تھا سب کا دیوانہ
کیا تھا اس نے دنیا کے دلوں میں اپنا گھر پیدا

وطن کو اس نے تعمیر و ترقی کے نشاں بخشے — مریضوں کو شفا دی، بے مکانوں کو مکاں بخشے
کہیں بجلی، کہیں صنعت کے گنج شائیگاں بخشے — جو خاک شور تھی اس کو بجو یہ گلستاں بخشے

وطن کے ریگ زاروں میں گئے لعل و گہر پیدا

خیال اس کا ہمارے دیش کی رُوحِ رواں ہوگا — وطن کا پاسبان تھا، پاسباں ہے پاسباں ہوگا
زمانے بھر میں اونچا اس کی عظمت کا نشاں ہوگا — وہ مرد کامران تھا، ملک اس کا کامراں ہوگا

نہیں وہ قوم مرتی جس میں ہوں ایسے بشر پیدا

جمیل مظہری

"محروم مرحوم" (تاریخ وفات تلوک چند محروم)

کیا رہ گیا دنیا میں بجز نقش قدم آہ — راہی طرف خلد ہوئے حضرت محروم
ہے گیسوئے اردو کی طرح طبع پریشاں — جذبات ادا کیجیے کس طرح بہ منظوم
خاک اڑتی ہے اب میکدۂ شعر و ادب میں — ارباب سخن ہند میں نا پاک ہیں مغموم
اٹھا جو جنازہ تو ہاتف نے صدا دی — از رحمت حق آج ہو محروم بھی مرحوم

۱۳۸۵ھ

رباعی

دل اہل معانی کے دو نیم آج ہوئے — از مرگ تلوک چند محروم افسوس
گم فن کے سب آثار قدیم آج ہوئے — آزاد و سخن دونوں یتیم آج ہوئے

پروفیسر مسعود حسین خاں

بیاد پروفیسر نجیب اشرف ندوی

حریم اردوئے بیکس کا پاسباں نہ رہا — ہزار حیف کہ اک پیر نوجواں نہ رہا
زباں روتی ہے، الفاظ سر پٹکتے ہیں — فغاں، کہ حرف و معانی کا اک جہاں نہ رہا
وہ اٹھ گیا تو یہ ارباب علم پر گزری — زمیں زمیں نہ رہی، اس پہ آسماں نہ رہا
بتا کہاں تجھے لے جائیں اے جبین نیاز — وہ سنگ در نہ رہا اور وہ آستاں نہ رہا
کسے بلائیں، کہاں جائیں لے دل محزوں — وہ میزباں نہ رہا اور وہ میہماں نہ رہا
وسیلہ کار دبستان شبلی و ندوی — ہزار حیف کہ اب اپنے درمیاں نہ رہا
فنا کی منزلیں طے زندگی سے کیا ہوں گی — حیات لغزش پا ہے یہ اب گماں نہ رہا

آنند نرائن ملاّ

مہاتما گاندھی کے قتل کے بعد

مشرق کا دیا گل ہوتا ہے مغرب پہ سیاہی چھاتی ہے
ہر دل سُن سا ہو جاتا ہے ہر سانس کی لَو تھراتی ہے
اتر دکھن، پورب پچھم، ہر سمت سے اک چیخ آتی ہے
نوعِ انساں کاندھوں پہ لئے گاندھی کی ارتھی جاتی ہے

آکاش کے تارے بجھتے ہیں، دھرتی سے دھواں سا اٹھتا ہے
دنیا کو یہ لگتا ہے جیسے سر سے کوئی سایا اٹھتا ہے

کچھ دیر کو نبضِ عالم بھی چلتے چلتے رک جاتی ہے
ہر ملک کا پرچم گرتا ہے، ہر قوم کو ہچکی آتی ہے
تہذیبِ جہاں تھراتی ہے، تاریخ بشر شرماتی ہے
موت اپنے کیے پر خود جیسے دل ہی دل میں پچھتاتی ہے

انساں وہ اٹھا جس کا ثانی صدیوں میں بھی دنیا جن نہ سکی
مورت وہ مٹی نقاش سے بھی جو بن کے دوبارہ بن نہ سکی

دیکھا نہیں جاتا آنکھوں سے یہ منظرِ عبرت ناکِ وطن
پھولوں کے لہو کے پیاسے ہیں اپنے ہی خس و خاشاکِ وطن
ہاتھوں نے بجھایا خود اپنے وہ شعلۂ روحِ پاکِ وطن
داغ اس سے سیہ تر کوئی نہیں دامن پہ ترے اے خاکِ وطن

پیغامِ اجل لائی اپنے اس سب سے بڑے محسن کے لئے
اے وائے طلوعِ آزادی! آزاد ہوئے اس دن کے لئے

جب ناخنِ حکمت ہی ٹوٹے دشوار کو آساں کون کرے
جب خشک ہوا ابرِ باراں ہی، شاخوں کو گل افشاں کون کرے
جب شعلۂ بینا سرد ہو خود جاموں کو فروزاں کون کرے
جب سورج ہی گل ہو جائے تاروں میں چراغاں کون کرے

ناشاد وطن! افسوس تری قسمت کا ستارہ ٹوٹ گیا
انگلی کو پکڑ کر چلتے تھے جس کی وہی رہبر چھوٹ گیا

اس حُسن سے کچھ ہستی میں تری اضداد ہوئے تھے آکے بہم
اک خواب و حقیقت کا سنگم مٹی پہ قدم نظروں میں ارم
اک جسم نحیف و زار مگر اک عزمِ جوان و مستحکم
چشمِ بینا، معصوم کا دل، خورشید نفس، ذوقِ شبنم
وہ عجز غرورِ سلطاں بھی جس کے آگے جھک جاتا تھا
وہ موم کہ جس سے ٹکرا کر لوہے کو پسینہ آتا تھا

سینے میں جو دے کانٹوں کو بھی جا اس گل کی لطافت کیا کہیے
جو زہر پیے امرت کر کے اس لب کی حلاوت کیا کہیے
جس سانس میں دنیا جاں پائے اس سانس کی نکہت کیا کہیے
جس موت پہ ہستی ناز کرے اس موت کی عظمت کیا کہیے
یہ موت نہ تھی قدرت نے ترے سر پہ رکھا اک تاجِ حیات
تھی زیست تری معراجِ وفا اور موت تری معراجِ حیات

یکساں نزدیک و دور پہ تھا بارانِ فیضِ عام ترا
ہر دشت و چمن، ہر کوہ و دمن میں گونجا ہے پیغام ترا
ہر خشک و تر ہستی پہ رقم ہے خطِ جلی میں نام ترا
ہر ذرّہ میں تیرا معبد، ہر قطرہ تیرتھ دھام ترا
اس لطف و کرم کے آئیں میں مر کر بھی نہ کچھ ترمیم ہوئی
اس ملک کے کونے کونے میں مٹی بھی تری تقسیم ہوئی

تاریخ میں قوموں کی ابھرے کیسے کیسے ممتاز بشر
کچھ ملکِ زمیں کے تخت نشیں کچھ تختِ فلک کے تاج بسر
اپنوں کیلئے جام و صہبا اوروں کے لیے شمشیر و تبر
نردِ انساں پٹتی ہی رہی دنیا کی بساطِ طاقت پر

مخلوقِ خدا کی بن کے سپر میداں میں، دلاور ایک توہی
ایماں کے پیمبر آئے بہت، انساں کا پیمبر ایک توہی

بازوئے خرد اڑ اڑ کے تھکے تیری رفعت تک جا نہ سکے
ذہنوں کی تجلی کام آئی تو خاکے بھی ترے ہاتھ آ نہ سکے
الفاظ و معنی ختم ہوئے عنواں بھی ترا اپنا نہ سکے
نظروں کے کنول جل جل کے بجھے پرچھائیں بھی تیری پا نہ سکے

ہر علم و یقیں سے بالاتر تو ہے وہ سپہرِ تابندہ
صوفی کی جہاں نیچی ہے نظر، شاعر کا تصور شرمندہ

پستی سیاست کو تو نے اپنے قامت سے رفعت دی
ایماں کی تنگ خیالی کو انساں کے غم کی وسعت دی
ہر سانس سے درسِ امن دیا، ہر جبر پہ دادِ الفت دی
قاتل کو بھی گر لب ہل نہ سکے آنکھوں سے دعائے رحمت دی

ہنسا کو اہنسا کا اپنی پیغام سنانے آیا تھا
نفرت کی ماری دنیا میں اک "پریم سندیسہ" لایا تھا

اس "پریم سندیسے" کو تیرے سینوں کی امانت بننا ہے
سینوں سے کدورت دھونے کو اک موجِ ندامت بننا ہے
اس موج کو بڑھتے بڑھتے پھر سیلابِ محبت بننا ہے
اس سیلِ رواں کے دھارے کو اس ملک کی قسمت بننا ہے

جب تک نہ بہے گا یہ دھارا شاداب نہ ہوگا باغ ترا
اے خاکِ وطن دامن سے ترے دھلنے کا نہیں یہ داغ ترا

جاتے جاتے بھی تو ہم کو اک زیست کا عنواں دے کے گیا
بجھتی ہوئی شمعِ محفل کو پھر شعلۂ رقصاں دے کے گیا
بھٹکے ہوئے گامِ انساں کو پھر جادۂ انساں دے کے گیا
ہر ساحلِ ظلمت کو اپنا مینارِ درخشاں دے کے گیا

تو چپ ہے لیکن صدیوں تک گونجے گی صدائے ساز تری
دنیا کو اندھیری راتوں میں ڈھارس دے گی آواز تری

سروجنی نائیڈو کی یاد میں

چمن کا روح شمیم چمن سلام تجھے
گلوں کا روح گل و یاسمن سلام تجھے

(۱)

ترے سخن کے سنولائے ہوئے دماغوں کا
تری ہی یاد سے روشن جگر کے داغوں کا
تری نظر کے جلائے ہوئے چراغوں کا
فروغ گم شدہ انجمن سلام تجھے

(۲)

اڑا کے لے گئے تارے ترے حسیں نغمے
سنے گی ایسے کہاں اب یہ سرزمین نغمے
ترے گداز جگر کے وہ آتشیں نغمے
سرود رفتہ ساز وطن سلام تجھے

(۳)

نظر میں مرہم زخم جگر چھپائے ہوئے
کدورتوں میں محبت کی لے بڑھائے ہوئے
سیاہیوں کو تبسم سے جگمگائے ہوئے
دیار تلخ کی شیریں دہن سلام تجھے

(۴)

خزاں کی فصل میں بھی نکہت بہار رہی
خروش نظم میں بھی تو ترانہ بار رہی
وطن کے دور جنوں میں بھی ہوشیار رہی
جہنّموں میں نسیم عدن سلام تجھے

(۵)

نگاہ و دل تھے محبت سے سر بسر معمور
جو نام کو بھی نہیں شعلہ خو وہ خالص نور
طہارت نفس آلائشوں سے کوسوں دور
طلوع صبح کی سیمیں کرن سلام تجھے

(۶)

جمال شمع بھی پروانہ کا گداز بھی تھی
ادب کی جان تھی خود اور ادب نواز بھی تھی
ردائے ناز میں کیفیت نیاز بھی تھی
سخن طراز عروس سخن سلام تجھے

(۷)

جہاں یہی ہے حدِ کعبہ و صنم خانہ — جہاں پہ ختم ہے ہر تفرقہ کا افسانہ
وہاں بھی تو تھا شہِ دلوں کی سلطانی — زبانِ شیخ و لبِ برہمن سلام تجھے

(۸)

خیال و فکر کی دنیا تری اسیرِ کمند — صفِ حیات میں انسانیت کا قد بلند
نباتِ لب میں سموئے ہے مشرق و مغرب قند — شکر فروشِ جدید و کہن سلام تجھے

(۹)

غرورِ قومیت و دیں کے کوہساروں میں — مذاقِ نسل و تمدن کے ریگزاروں میں
الگ الگ سے حیاتِ جہاں کے دھاروں میں — ترانۂ لبِ گنگ و جمن سلام تجھے

(۱۰)

نئے پیام وطن کو، نئے رسول ملے — نئی نظر، نئے مقصد، نئے اصول ملے
ہر ایک کیاری سے گلشن کو اپنے پھول ملے — وطن کے تاج کے لعلِ وطن سلام تجھے

چمن کا، موجِ شمیمِ چمن سلام تجھے
گلوں کا، روحِ غزل و یاسمن سلام تجھے

بوئے گم شدہ (ڈاکٹر ذاکر حسین کی یاد میں)

کتنی بے ربط ہے دھارے پہ سفینوں کی قطار — صرف اک ناؤ گئی جانبِ ساحل ساقی
صفِ اول سے فقط ایک ہی میخوار اٹھا — کتنی سنسان ہے لیکن تری محفل ساقی
ایک ہی شمع بجھی موت کے ہاتھوں لیکن — کتنی تاریک ہوئی قوم کی منزل ساقی
ایک کلی آئی تھی خوشبو لیے دم بھر کے لیے — وہ گئی، پھر وہی کانٹوں کی ہے محفل ساقی
دفن ہو جائے نہ خوشبو بھی کہیں پھول کے ساتھ — یہی خوشبو تو ہے اس بزم کا حاصل ساقی

؎ جناب مُلّا صاحب کی پیشِ نظر نظم برصغیر کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی اتنی مقبول ہوئی کہ دنیا کی متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔

تتمۂ کتاب

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ مثالیں کچھ ضرورت سے زیادہ پیش کردی گئی ہیں، لیکن معترضین کو اردو مرثیہ کی وسعت و ہمہ گیری دکھانا تھی اور ناظرین پر واضح کرنا تھا کہ ہماری اس نادر و نایاب صنف سخن پر جس طرح کے اعتراضات کیے گئے ہیں وہ مہمل و بے بنیاد ہی نہیں ہیں، بلکہ خود معترضین کی کم آگاہی، کوتاہ بینی اور نقصور مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ ہمارے مرثیہ گویوں نے ایک ایسی صنف سخن ایجاد کی ہے جو عالمی ادب میں اس تفصیل اور اس حسن کے ساتھ کہیں موجود نہیں۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم اپنے سرمایۂ غزل کو، جو یقیناً بڑی حد تک تقلیدی ہے مرکز توجہ بنائے ہوئے ہیں اور مرثیوں کے بے بہا خزانہ کی محض ایک جھلک دیکھ لینا یا رسماً متعارف ہو جانا ادیب و ناقد کہلانے کے لئے کافی و وافی سمجھتے ہیں مرثیوں نے جتنی بے شمار نئی نئی تشبیہیں، اور نئے نئے استعارے ہمارے لئے مہیا کئے ہیں، اور ایک ہی بات کو کہنے کے جس طرح سیکڑوں الگ الگ ڈھنگ بتائے ہیں، یا جس فراوانی، بہتات اور بڑا افر طور پر ہمیں تہذیب و اخلاق و مروت و اخوت و مودت و غیرت و حمیت، ہمت و جسارت، شرافت و انسانیت، دلیری و مردانگی، راست بازی و حق پژوہی و وفا شعاری، آشتی و دوستی، ایثار و انکسار، صبر و تحمل، عزم و استقلال، غرض تمام و کمال اوصاف حسنہ کی تعلیم دی ہے وہ کسی دوسری صنف ادب میں نہ تو یکجا مکمل موجود ہیں۔ اور نہ ان کا موجود ہونا ممکن ہے۔

ضروری ہے کہ ہمارے جامعوں میں مرثیوں کا مطالعہ اور ان کا فنی نقد ایک موضوع خاص قرار دیا جائے۔ اس سے طلبا کے پاس ہماری زبان کے الفاظ کا ذخیرہ بڑھے گا۔ اور اردو کے محاورات اور روزمرّہ کے برمحل اور صحیح استعمال کا انھیں سلیقہ آئے گا۔ وہ بات کہنے کا ڈھنگ سیکھیں گے۔ وہ اپنی زبان کی شیریں مقالی، تلخ کلامی اور طنز نگاری سے کماحقہ واقف ہوں گے۔ نئے نئے اسلوب اور لطیف سے لطیف انداز و طرز تحریر سے آگاہی حاصل کریں گے۔ اور سب سے اہم بات وہ صحیح اعلیٰ اخلاق و آداب سے روشناس ہوں گے۔ اور انھیں صالح تہذیب کا علم ہوگا۔ متانت سنجیدگی سے مسائل زندگی پر غور کرنے کا ان میں شوق پیدا ہوگا۔ اور وہ شہدائے کربلا کے کرداروں کی تقلید و تاسّی پر مائل ہوں گے۔ جو یقینی آپ اپنی مثال تھے۔

تعلیم کا اصل مقصد ہر ایک فرد کو ایک اچھا اور مفید شہری بنانا ہے اور اس میں اس گداز دل کا پیدا کرنا ہے جس کا نام شرف انسانیت ہے مرثیہ کا مطالعہ اس مقصد اعلیٰ کے حصول کا سب سے بہتر اور موثر آلہ ہے اس لئے اس کے غائر اور وسیع مطالعہ سے چشم پوشی ادبی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے گناہ کبیرہ ہے۔"

حسینی

(نوٹ) جناب حسینی صاحب کی اجازت کے ماتحت مرثیے کی مثالوں کے چند
اشعار بعد میں شامل کیے گئے ہیں   (نائب حسین نقوی)